دوسرا باب

اوراقِ گزشتہ

اتوار صبح دس بجے، مورخہ چھ جنوری:

عمر اس وقت تفتیشی کمرے کے باہر موجود انتظار گاہ میں اکیلا بیٹھا تھا، جہاں اُسے فلحال انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ انتظار گاہ گول کمرے کی مانند تھی، جسکا کوئی سرا نہ تھا، درمیان میں ایک دروازہ تھا، جسکی ایک جانب سے دیوار گیر صوفہ شروع ہوتا تھا، جو کمرے کی گولائی کے ساتھ ہی گھومتے ہوئے دروازے کی دوسری جانب آکر ختم ہو جاتا تھا۔ کمرے کی دیوار پر ایک جانب اسمارٹ ٹی وی لگا ہوا تھا، جس پر اس وقت کوئی خبر نامہ نشر ہو رہا تھا۔ سردی ہونے کی باعث کمرے کا اے سی بند تھا لیکن پھر بھی کمرے میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ شاندار لائٹنگ ہونے کے باوجود بھی یہ کمرہ وحشت زدہ سا لگتا تھا۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ تب ہی دروازہ اچانک سے کھلا۔

وقت، سانسیں، آوازیں سب رک گئی۔۔۔

حواس، سماعت، عقل سب سلب ہو گئی۔۔۔

اور آنے والے کو دیکھ کر جہاں عمر ساکت ہوا تھا، وہیں اُسکے قدم بھی جیسے لمحے بھر کو تھم گئے تھے۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑا اُسے دیکھتا رہا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ آگے بڑھ کر اُسے مخاطب کرے یا خاموشی سے ایک کنارے پر بیٹھ جائے؟ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ عمر نے خود ہی اُسکی مشکل آسان کر دی۔

"السلام و علیکم!" عمر نے سر کے اشارے سے اُسے سلام کیا تو وہ بھی اشارے سے جواب دیتا سامنے رکھے صوفے پر جا بیٹھا۔ پھر کافی دیر اُن دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی، جیسے دونوں ہی نہ سمجھ پا رہے ہوں کہ بات کہاں سے شروع کریں؟ کریں بھی یا نہیں؟ حالانکہ عمر، مہینہ بھر پہلے اُسے دیکھ چکا تھا، پورے دس سال بعد۔۔۔ لیکن آج پھر سے اُسے سامنے دیکھ، وہ ویسے ہی گم صم سا ہو گیا تھا، جیسے آخری بار اُسے، اُسکے آفس میں دیکھ کر ہوا تھا۔ عمر خاموش تھا جبکہ وہ سامنے بیٹھا اپنے لب کاٹ رہا تھا۔ ایسا وہ شدید پریشانی میں کرتا تھا، عمر مسکرا دیا۔ دس سال بعد بھی کچھ چیزیں ویسی ہی تھیں۔

پھر اُس نے واپس سر جھکا دیا۔ کیا فائدہ تھا مخاطب کرنے کا جبکہ سامنے والا شاید پہچاننے کا روادار بھی نہ تھا؟ اگر وہ بات نہیں کرنا چاہتا تو اسے بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ اجنبیت برت رہا تھا تو وہ کیوں دوستی نبھاتا؟ ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ کچھ لمحے مزید سر کے پھر کمرے میں اُسکی آواز گونجی۔

''کیسے ہو عمر؟'' اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا ہو۔ گول کمرے کی دیواروں سے مقدم کی آواز ٹکرا کر واپس آگئی تھیں۔ جبکہ وہ خود سنجیدہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے براہ راست عمر کو ہی دیکھ رہا تھا۔

''آن۔۔۔ میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں، الحمدللہ۔۔ تم کیسے ہو؟'' اس نے بمشکل کہا۔ دماغ میں سوالات کے انبار جمع ہونے لگے، جسے وہ زبان پر لانے سے روکے ہوئے تھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔۔'' مقدم نے ویسی ہی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مجھے لگا تھا کہ شاید تم مجھے پہچان نہیں سکے۔۔۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ زبان سے پھسل گیا تھا۔ اور پھر اُس نے دیکھا تھا مقدم کو، سر جھکاتے ہوئے، وہ اُسے شرمندہ تو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے افسوس ہوا، اتنی جلدی شکوہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دس سالوں کا بھرم رکھنا ضروری تھا۔

''تمہیں نہ پہچانوں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟'' اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔ اتنے آہستہ، جیسے خود سے مخاطب ہو۔ لیکن اُس نے سنا تھا، سنا تھا جو اُس نے کہا تھا۔ **''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا''** اس ایک جملے میں کچھ تو تھا۔۔۔ کچھ ایسا کہ عمر کو اپنے تمام گلے شکوے بھولتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کچھ دیر کہ لیے وہ بھول گئے تھے کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ دونوں یہاں کر کیا رہے ہیں؟ لیکن اس وقت وہ جیسے کہیں اور ہی تھے۔ کسی اور ہی دنیا میں۔۔۔

اُس ایک جملے کے بعد اُن دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مقدم چپ سا بیٹھا تھا، اور عمر اپنی ہتھیلیوں پر نظریں جمائے۔ اُن ہتھیلیوں پر کچھ منظر بنتے پھر مٹ جاتے، پھر بنتے پھر مٹ جاتے۔ مقدم کے دماغ کے اوراق بھی ماضی کا سفر کر رہے تھے۔ بہت سے مناظر اُسکی نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں خود کو ان مناظر کا حصہ محسوس کرنے لگے۔ یادوں کو باہر آنے سے تو روک دیا تھا لیکن خود کو ماضی میں جانے سے کیسے روکتے؟

وہ وہیں جا چکے تھے آج سے سولہ سال پہلے۔۔

----------+----------+----------

سولہ سال پہلے:

صبح نو بجے کا وقت تھا، سال کے پہلے مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی، جہاں سیمسٹر بریک کے بعد کلاسز کا آغاز ہوا تھا، وہیں نو واردان کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ جامعہ کے تمام داخلی دروازوں سے جوق در جوق طلبہ داخل ہو رہے تھے۔ کچھ حیران پریشان سے چہرے لیے اپنے ڈیپارٹمنٹ تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے جو کہ ایک مشکل کام معلوم ہوتا تھا۔ کچھ ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈنے کی کوششوں میں مستقل بھٹکتے ہی چلے جا رہے تھے۔ حالانکہ جامعہ میں کلاسز کا آغاز ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا، لیکن اب تک نئے طالبعلموں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ پرانے طلبہ ان سب میں الگ سے نمایاں تھے۔ کچھ شیطان کے بچھڑے ہوئے لواحقین، نو واردان کی اس حالات سے حظ اٹھاتے ہوئے انہیں مزید بھٹکا رہے تھے، تو کچھ بیزار سی شکلیں لیے دنیا سے تمام تعلق توڑے، بس اپنی کلاس میں وقت پر پہنچنے کی سعی کر رہے تھے، ایسے میں اگر کوئی بھولا بھٹکا نیا طالب علم ان آدم بیزاروں سے اپنا مطلوبہ ڈیپارٹمنٹ پوچھ لیتا تو یہ نہایت ہی برا منہ بنا کر کہتے کہ ''ہمیں خود نہیں معلوم'' حالانکہ معلوم انہیں سب تھا۔ جبکہ تیسری قسم کے سینئرز ایسے بھی تھے جو فی سبیل اللہ نئے آنے والوں کو انکے ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ کر آ رہے تھے۔ لیکن ایسی قسم شاذ و نادر ہی نظر آ رہی تھی۔ ایسے میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے ڈیپارٹمنٹ کی ایک جماعت میں طلبہ و طالبات کی حاضری لگانے کے لیے نام پکارا جا رہا تھا۔

''آغا مقدم۔۔۔۔'' استاد نے اُسکا نام پکارا۔ پر جماعت میں خاموشی چھائی رہی۔ کچھ چہروں نے یہاں وہاں مڑ کے دیکھا لیکن کوئی جواب نہ پا کر واپس اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

''آغا مقدم شفیق۔۔۔'' اُنہوں نے دوسری مرتبہ نام پکارا لیکن اس بار بھی جواب ندارد تھا۔ اب کی بار کسی نے بھی دیکھنے کی کوشش نہ کی، پچھلے ایک ہفتے سے اس نام کے آگے غیر حاضری کا نشان لگ رہا تھا۔

''غیر حاضر'' استاد نے تاسف سے زیر لب کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اُسکے نام کے آگے غیر حاضری لگا ہی دیتے، جماعت میں زوردار آواز گونجی۔

''پریسینٹ سر''اس آواز پر پوری جماعت نے ایک ساتھ مڑ کے پیچھے دیکھا تھا، کلاس کے پچھلے دروازے پر کھڑے، اُس سرخ و سفید رنگت والے لڑکے کو دیکھ کر ہی لگ رہا تھا کہ بہت دُور سے پیدل چلا آرہا ہے، طلباء وطالبات بڑے اشتیاق سے اُسے ہی دیکھنے لگے۔ کیسے نہ دیکھتے؟ ایک ہفتے سے مختلف کلاسز میں اُسکا صرف نام ہی سن رہے تھے، اب جا کے اس نے شکل دکھائی تھی۔ استاد نے بھی اوپر سے نیچے تک اُسے دیکھا بلکہ گھورا تھا۔

''آج پہلا دن ہے تمہارا؟''انہوں نے پوچھا۔

''دنیا میں؟''اس نے معصومیت سے وضاحت مانگی۔ کلاس میں ہنسی کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

''نہیں! میری کلاس میں؟''انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں سر!''

''دو ہفتوں سے کہاں تھے؟''ایک اور سوال۔

''سوات۔۔۔''مختصر جواب۔

''اوہو۔۔۔''کلاس میں مختلف آوازیں گونجیں۔

''کیا کر رہے تھے وہاں؟''

''آخری دن منا رہا تھا سر!''آگے سے پھر بے تکا جواب آیا۔

''زندگی کے؟''اُنہوں نے بھی اتنی ہی سنجیدگی سے وضاحت مانگی، اب کے پوری کلاس زور سے ہنسی تھی۔ انہیں یہ گفتگو سننے میں مزا آرہا تھا۔

''نہیں! آزادی کے''

''کیوں؟ پڑھنا لکھنا پسند نہیں ہے؟''

''نہیں سر! پڑھنے لکھنے کو میں پسند نہیں ہوں شاید''مزید معصومیت سے جواب آیا۔

''مجھے مل جاتے ہیں ہر سال ہی ایسے۔۔۔''اب کہ اُنہوں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''کیسے؟''اشتیاق سے پوچھا۔

''جنکو پڑھائی لکھائی پسند نہیں کرتی''

''اچھا۔۔۔کیا میں اندر آسکتا ہوں؟''مزید معصومیت۔

''اب آہی گئے ہو تو باہر کھڑے ہو کر کیا کروگے؟ آجاؤ۔۔۔''انہوں نے گویا احسان کیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آیا اور پیچھے والی نشستوں میں سے، ایک ڈیسک کے پاس پہنچا، جہاں دو لوگ بیٹھتے تھے۔ کلاس سیڑھیوں پر مشتمل اوپر سے شروع ہو کر نیچے تک جاتی تھی، جہاں سامنے روسٹرم پر استاد کھڑے، بقایا طالبعلموں کی حاضری لے رہے تھے۔ پیچھے والی ڈیسک پر ایک لڑکا بیٹھا تھا۔اس نے لڑکے کے پاس جا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

''میرا نام آغا مقدم ہے۔ کیا میں آپکے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟''ڈیسک پر بیٹھے خوش شکل لڑکے نے تھوڑا آگے کھسکتے ہوئے، فوراً اُسکے لیے جگہ بنائی تو وہ بیٹھ گیا۔

''اور سناؤ! تمہارا بھی پہلا دن ہے آج کلاس میں؟''اس نے بستہ نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں پچھلے ایک ہفتے سے آرہا ہوں''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو اکیلے کیوں بیٹھے ہو لڑکے؟ دوست نہیں بنائے اب تک؟''وہ حیران ہوا۔

''اتنی جلدی کیسے دوستی ہو سکتی ہے؟''لڑکا اُس سے بھی زیادہ حیران ہوا۔

''ایک ہفتہ جلدی ہوتا ہے کسی سے بات کرنے کے لیے؟''مقدم پہلے سے زیادہ حیران۔۔۔

''ارے نہیں! علیک سلیک تو سب سے ہے لیکن دوستی ابھی کسی سے نہیں ہوئی''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مسکرانا جیسے عادت تھی اُسکی۔

''چلو یار! کوئی نہیں، آج مجھ سے دوستی کر لو''مقدم نے ہاتھ بڑھایا جو اس نے خوش دلی سے تھام لیا۔

''اب خاموش ہو جاؤ سر پڑھانا شروع کر رہے ہیں''اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''نام تو بتاد و اپنا''مقدم نے بھی آہستہ سے پوچھا۔

''عمر۔۔۔۔ عمر حفیظ''

----------+----------+----------

صبح نو بجے کا وقت تھا، آج جامعہ میں اُسکا پانچواں دن تھا۔ ہر طرف ایک گہما گہمی سی تھی۔ کلاس لینے کے بعد وہ بھٹکتا بھٹکتا کینٹین چلا آیا۔ سامنے اُسے ایک لڑکا نظر آیا، پچھلے پانچ دنوں سے کلاس میں حسین اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اب تک نہ کسی سے دوستی کی نہ ہی بات چیت۔

کینٹین آتے ہوئے راستے میں پڑنے والے مختلف ڈیپارٹمنٹ میں، اُسے طالبعلم ایک دوسرے کی تصاویر کھینچتے ہوئے یا پھر کرکٹ یا ٹینس کھیلتے ہوئی نظر آئے تھے۔ کچھ بلاوجہ ہی بیٹھے ہوئے گپے مار رہے تھے۔ ایسے میں وہ لڑکا خاموشی سے سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس نے کسی سے بھی بات کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور ساری دنیا کو چھوڑ کر جناب حسین بلاوجہ ہی اُسکے پاس چلے آئے۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''حسین نے پوچھا تو کسی گہری سوچ میں غرق، رضا نے اُسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

''مرضی ہے''اس بے تکے جواب پر تو حسین کو، اُسے بھاڑ میں جھونک کر چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بھی ڈھٹائی سے وہیں بیٹھ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''رضائے الٰہی''بیزار سے منہ کے ساتھ جواب دیا، جیسے حسین کا بیٹھنا بہت ہی ناگوار گزر رہا ہو۔

''کیا بات ہے؟ اتنے خاموش کیوں ہو؟''حسین نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

''میں خاموش ہی رہتا ہوں'' رضا نے مزید بیزاری سے کہا۔

''تو کیوں رہتے ہو؟ دوستی کرو کسی سے، بات چیت کرو، کچھ تفریح کرو''

''میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا'' مزید روکھا جواب آیا تھا۔

''ٹھیک ہے نہ کرو، مگر دوستی کیوں نہیں کرتے کسی سے؟'' حسین نے دل ہی دل میں اپنی ہمت کو داد دی۔

''میری مرضی۔۔۔'' وہ بلاوجہ ہی کوفت کا شکار ہو رہا تھا۔ چائے کا آرڈر دے دیا تھا، اسی لیے یہاں سے اٹھ کر جا بھی نہیں پا رہا تھا۔

''گھر سے مار کھا کر تو نہیں آئے؟'' رضا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حسین کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کی اتنی بیزاری کے باوجود وہ کیوں اس سے بات کر رہا تھا؟ ایسی کیا کشش تھی اس میں کہ ہر کوئی اس سے بات کرنا چاہتا تھا؟ اور ایسا وہ پچھلے پانچ دنوں میں دیکھ چکا تھا کہ کلاس کا ہر طالب علم اُس سے بات کرنے کا خواہش مند تھا، اور وہ عجیب آدم بیزار مزاج کا حامل تھا۔

''دیکھو! مجھے نا۔ آج صبح صبح میرے باپ نے گھر سے نکال دیا ہے'' اس نے اطمینان سے بتایا تو رضا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اور پہلی بار اُس نے رضا کے چہرے کے تاثرات فکر مندی میں بدلتے دیکھیں تھے۔

''کیوں؟'' وہ ناچاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

''میری امی، صبح نماز پڑھ رہی تھیں۔ انکے گھٹنوں میں درد رہتا ہے، تو وہ صوفے پر بیٹھ کر نماز پڑھتی ہیں۔ میں انکے پاس گیا اور جا کے انکے قدموں میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے بال کھینچنا شروع کر دیے'' حسین رکا۔

''کیوں؟'' بال کھینچنے والی بات پر وہ حیران ہوا۔

''ایسے ہی۔۔۔ انکی عادت ہے۔ میں نے پوچھا، امی! جب آپکے پاس آؤ تو آپ بال کیوں کھینچنے لگ جاتی ہیں؟ کہنے لگیں کہ یہ میرے پیار کرنے کا طریقہ ہے۔ اب قسم لے لو! میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ابّو پیچھے کھڑے ہیں۔ میں نے بس اتنا کہا تھا امی سے، کہ ابّو کو بھی آپ نے ہی گنجا کیا ہے؟ اب اس میں گھر سے نکالنے والی کیا بات تھی بھلا؟'' دنیا جہاں کی مظلومیت چہرے پر سموئے اپنی داستان

سنائی۔ رضا کے منہ سے نکلنے والا قہقہہ بے ساختہ تھا، اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ آس پاس بیٹھے ہم جماعتوں نے مڑ مڑ کر یہ منظر دیکھا تھا۔ بھلا وہ کونسا روز روز ہنستا تھا؟

''ہنسومت! میں بہت دکھی ہوں'' مزید مظلومیت طاری کیے کہا۔

''ہاہاہا۔۔۔ نظر آرہا ہے کہ تم کتنے دکھی ہو'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد وہ اس طرح بے ساختہ اور کھل کر ہنسا تھا اور وہ بھی اتنی دیر تک۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' بلآخر رضا نے پوچھ ہی لیا۔

''حسین۔۔۔ حسین مرتضیٰ''

''چائے پیو گے حسین؟'' اب کے اس نے خوشدلی سے پوچھا تھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ؟'' اُسکے بعد اُن دونوں نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی، حسین مستقل کوئی نہ کوئی قِصّہ اُسے سناتا رہا، جواباً وہ بس ہلکے سے مسکرا دیتا۔

اگلے دن کلاس میں، حسین خود ہی اُسکے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اور نجانے کس طرح، پر اُس نے رضا سے دوستی کر لی تھی۔ کبھی کبھی رضا حیران ہوتا کہ حسین جیسے بندے نے، پوری جماعت کے طالبعلموں کو چھوڑ کر اُسے ہی کیوں دوست منتخب کیا تھا؟

''بات سنو لڑکے'' کلاس ختم ہونے کے بعد وہ دونوں باہر نکل رہے تھے، جب اپنے پیچھے سے اُنہیں کسی کی آواز سنائی دی۔ دونوں نے ہی مڑ کے پیچھے دیکھا۔ نیلی جینز پر نیلی پولو شرٹ پہنے، وہ لڑکا اپنی ڈیسک پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔

''اِدھر آؤ'' انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اُسکے پاس ہی ایک اور لڑکا بیٹھا، نہایت بے زاری سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''میں؟'' مقدم نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر تصدیق کرنا چاہی کہ آیا اُسے ہی بلایا گیا ہے یا کسی اور کو؟

''ہاں ہاں! تم'' اس نے کہا تو وہ ذرا حیران سا اُسکے پاس گیا۔ عمر بھی ساتھ ہی تھا۔

''کیا کام ہے؟'' پاس جا کر پوچھا، اس سے پہلے کہ لڑکا کوئی جواب دیتا، اُسکے ساتھ بیٹھا بے زار سا لڑکا بول اٹھا۔

''کوئی کام نہیں ہے اسے، بیکار آدمی ہے یہ اسکی باتوں میں نہ آیا کرو''

''تم چپ کرو'' اس نے اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔'' اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔

''کہ'' مقدم نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''سوات میں تمہارا اپنا گھر ہے؟'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میرے باپ کا ہے، تم نے دعوت پر آنا ہے؟'' مقدم نے شرارت سے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لو، مجھے بڑا شوق ہے سوات جانے کا'' لڑکے نے اشتیاق سے کہا۔

''مفت میں تو میں کسی کو نہیں بلاتا'' مقدّم آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

''قیمت؟''

''خالص دوستی'' اس بات پر وہاں قہقہہ پڑا تھا۔

''یار! تم مجھے ایسے ہی تو اچھے نہیں لگے؟ کہاں تھے اتنے دنوں سے، پہلے کیوں نہیں ملے مجھے؟ کم از کم اس آدم بیزار آدمی سے دوستی نہ کرنی پڑتی'' لڑکے نے ہنستے ہوئے اپنے دوست کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جس نے اُسے مکمل نظر انداز کیا تھا۔ اُنہوں نے اب دیکھا تھا کہ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر نمایاں گڑھے پڑتے تھے۔ اور زندگی اُسکی آنکھوں میں جیتی تھی۔

''بس، قسمت میں آج ملنا لکھا تھا، یہ میرا دوست ہے، عمر حفیظ'' اس نے لگے ہاتھوں تعارف کروایا۔

''ہاں ہاں! جانتا ہوں اس فادر ٹیریسا کو'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو عمر نے برا سا منہ بنایا۔

''اس بات کا کیا مطلب؟'' مقدم نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''مطلب پھر کسی دن بتاؤنگا، ابھی تم مجھ سے ملو'' وہ اُچھل کر نیچے اترا۔

''میں حسین مرتضیٰ'' اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جسے پوری خوشدلی سے تھاما گیا تھا۔

''اور یہ میرا دوست ہے، رضاالٰہی'' اس نے پاس بیٹھے لڑکے کی جانب اشارہ کیا تو رضا، جو کچھ دیر قبل بیزار سا بیٹھا تھا، اب مسکراتے ہوئے اُن سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

''چلو! آج تمہارا پہلا دن ہے، تو اس خوشی میں تمہیں یونیورسٹی کی سیر کرواتے ہیں۔'' '' حسین نے کہا تو رضا نے پھر سے بیزار سا منہ بنا لیا۔

''میرا بلکل موڈ نہیں ہے یونیورسٹی کے چکر کاٹنے کا، ویسے بھی آدھے گھنٹے بعد دوسری کلاس شروع ہو جائے گی'' رضا نے خود کو اس منصوبے سے باہر کر لیا۔

'' صحیح کہہ رہا ہے، یہ یونیورسٹی گھومنے کا پلان پھر کسی دن کے لیے'' عمر نے بھی تائید کی تھی۔

''ٹھیک ہے، لیکن چائے تو پی جا سکتی ہے نا'' حسین نہیں ٹلنے والا تھا۔

''ہاں! یہ کر سکتے ہیں'' اس پر سب راضی تھے۔ پھر وہ سب کینٹین کی طرف چل دیئے۔

----------+----------+----------

اور کچھ ہی دنوں میں مقدم کو معلوم ہو گیا کہ عمر کو **"فادر ٹریسا"** کا لقب کیوں دیا تھا حسین نے؟ کیونکہ وہ ایک درد مند دل رکھنے والا انسان تھا۔ بے حد خوش اخلاق، خوش مزاج اور ہر ایک کا خیال رکھنے والا۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر میں گھلنے والا لیکن اپنے مزاج کے برخلاف اُسکی ایک عادت تھی، وہ اتنی آسانی سے کسی سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ علیک سلیک ہر ایک سے رکھتا تھا، مگر دوستی نہیں، لیکن یہ مقدم تھا، جس نے اُسے خود سے دوستی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے وہ لوگ ساتھ ساتھ ہی تھے۔ آج بھی حسین اور رضا انکے ساتھ کینٹین میں بیٹھے تھے، جہاں اور بھی بہت سے طالبعلم موجود تھے۔ رضا آج گھر سے بنا کچھ کھائے پیئے ہی آیا تھا، لہٰذا پورا پورا

ناشتہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔تینوں ایک ہی میز پر بیٹھے، رضا کا انتظار کر رہے تھے۔ جو ناشتے کا آرڈر دینے گیا تھا۔ سیلف سروس تھی، اسی لیے وہ کاؤنٹر کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''یار! وہ اکیلے ہی سارا سامان کیسے لائے گا؟''عمر کو رضا کی فکر ہو رہی تھی، جسے چار ڈسپوزیبل چائے کی پیالیاں اور ایک عدد پراٹھے کی پلیٹ بھی ساتھ لانی تھی۔

''ابھی آرڈر آیا نہیں ہے نا؟ جب آئیگا تو وہ اشارہ کر دے گا۔ بیٹھے رہو چپ کر کے''مقدم نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! لیکن بیچارہ اتنی دیر اکیلے کیا کریگا؟ میں جا کے اُسے کمپنی ہی دے دیتا ہوں''وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔اُسکے ضمیر کو چین نہیں آنے والا تھا۔

''اشاروں کی زبان آتی ہے؟''حسین نے حیران ہونے کی ناکام کوشش کی۔

''مطلب؟!''''دونوں حیران ہوئے۔

''تم کم بولتے ہو اور وہ تو بولتا ہی نہیں ہے، اب دو گونگے ایک دوسرے کو کیسے کمپنی دینگے؟''حسین نے مزے سے کہا، تو عمر جواب دینے کے بجائے اُسکے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے چلا گیا۔

''یہ بلی یہاں کیوں گھوم رہی ہے؟''مقدم نے اپنے پاؤں کے پاس موجود بلی کو دیکھ کر کہا۔

''اسے بھی تم پسند آگئے ہوگے''حسین نے جواب دیا۔اب دونوں کی توجہ کا مرکز وہ بلی تھی۔

عمر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔اُسکے ارد گرد مختلف کرسیوں اور میزوں پر لاتعداد طلباء و طالبات اپنے اپنے گروپ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی چائے پی رہا تھا، کوئی ناشتہ کر رہا تھا تو کوئی صبح ہی صبح سموسے رول لیے بیٹھا تھا، لیکن اُسکی نظریں رضا پر تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز کاؤنٹر کی ساتھ والی دیوار پر ٹیک لگائے، اس طرح کھڑا تھا کہ اُسکا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا پاؤں الٹا موڑ کر دیوار سے ٹکایا ہوا تھا۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹے، اُسکی نظریں فرش پر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھی۔ عمر نے اُسے غور سے دیکھا، ایک نامعلوم سے اُداسی تھی اُسکے چہرے پر۔ پچھلے کچھ دنوں میں اُسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ رضا بہت خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم صم

رہنے والا لڑکا ہے۔ لیکن اُسکے باوجود بھی چند ہفتوں میں اس نے اپنی قابلیت سے اساتذہ اور کلاس کے تقریباً تمام طالبعلموں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ باوجود اسکے کہ پوری کلاس اس سے بات کرنے کی خواہشمند رہتی تھی، وہ گنتی کے چند لوگوں سے ہی بات کرتا تھا۔ کبھی کبھی عمر کو حیرت ہوتی تھی کہ حسین جیسے انسان نے اس سے دوستی کیسے کرلی تھی؟ لیکن اس بات کا بھی بڑا اچھا جواب ہوتا تھا اس بدتمیز کے پاس، کہتا تھا

''جیسے مقدم نے تمہارے جیسے خوار آدمی سے کرلی''

وہ رضا کے قریب پہنچا تو وہ چونک اٹھا۔

''ارے! تم کیوں آگئے؟ میں لے آتا نا'' اُسے عمر کی عادت کا پتہ تھا۔

''خیر ہے یار!۔۔۔ ویسے بھی میں بور ہو رہا ہے تھا اُن دونوں کے بیچ میں'' اُس نے اُسکے برابر میں، اُسی انداز میں ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں مانتا'' رضا نے بیساختہ کہا تو دونوں ہنس دیئے۔

''بھائی! آپکا آرڈر'' کاؤنٹر کے اندر سے آواز آئی، تو وہ آگے بڑھے گئے۔ سامان لے کر رضا نے بل ادا کیا اور اب دونوں آہستہ آہستہ چلتے واپس آرہے تھے۔ عمر نے دو ڈسپوزیبل چائے کی پیالیاں پکڑ رکھی تھیں۔ جبکہ رضا نے ایک پیالی دائیں ہاتھ میں اور دوسری بائیں ہاتھ میں رکھی پراٹھے کی پلیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ دُور کرسیوں پر اُنہیں مقدّم و حسین بیٹھے نظر آرہے تھے۔

''ویسے ناشتہ کیوں نہیں کیا آج؟'' عمر نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''بس، آج دل نہیں کر رہا تھا بنانے کو''

''کیا مطلب؟ تم خود ناشتا بناتے ہو؟'' عمر حیران ہوا۔

''ہاں!'' آہستہ سے جواب دیا۔

''کیوں؟ اکیلے رہتے ہو؟'' حالانکہ عمر اتنے سوالات نہیں کرتا تھا، پر رضا کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی جو سامنے والے کو اُس سے بات کرنے پر اکساتی تھی۔

''ایسا ہی سمجھ لو''اس نے مسکراتے ہوئے کہا،اُس مسکراہٹ میں بھی اُداسی گھلی تھی،پر اُسکے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔سامنے سے تین لڑکوں کا گروپ چلا آرہا تھا۔اُن میں سے ایک نے رضا کو دیکھتے ہوئے "ہیر سٹائل اچھا ہے برو" کہا اور ساتھ میں انگوٹھا اٹھا کر پسندیدگی کا اشارہ دیتے ہوئے پاس سے گزر گیا،وہ دونوں ہی بس مسکرا دیئے۔

''اتنا اُداس کیوں رہتے ہو؟''عمر نے بیساختہ ہی سوال کیا۔

''کون؟میں؟''وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں''

''نہیں نہیں۔۔۔میری فطرت ہی ایسی ہے شاید''اس نے ہنستے ہوئے کہا تو عمر نے بس سر ہلا دیا۔وہ میز کے قریب پہنچے تو حسین اُنہیں ہی گھور رہا تھا۔

''کونسے راز و نیاز کرتے ہوئے آرہے تھے تم لوگ؟یہاں بھوک سے مرنے ہی والا تھا میں''

''کونسی بھوک؟پراٹھے تو بس رضا کے ہیں۔تمہارے لیے چائے ہے''عمر نے اُسکے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!تو میں چائے کی بھوک کی بات ہی کر رہا تھا''اُس نے پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

قریب ہی ایک اور میز پر لڑکے لڑکیوں کا گروپ بیٹھا تھا۔اُن میں سے ایک لڑکے کے پاس گٹار تھا،اُس گٹار کی دھن پر وہ اُنہیں کوئی انڈین گانا سنا رہا تھا۔اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے اتنی بھونڈی آواز پر بھی اُسکے گروپ والے،اس سے فرمائش کر کر کے گانا سن رہے تھے۔

''یہ سائنس والے اتنے فارغ کب سے ہو گئے؟''حسین نے چائے کی سپ لیتے ہوئے کہا۔

''اوہنوں۔۔۔''مقدم نے نفی میں سر ہلایا''سائنس نہیں،یہ آرٹس والے ہیں''

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میں نے اس پر کافی غور و خوص کیا ہے اور اُسکے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر ڈیپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹس میں کوئی ایک منفرد بات ہے،جو اُنہیں باقی سب سے نمایاں کرتی ہیں''

''مثلاً؟''

''مثلاً۔۔۔اب تم مینجمنٹ سائنسز کے ڈپارٹمنٹز کے طالبعلموں کو دیکھو۔۔۔روبوٹ جیسی زندگی ہے انکی۔ وقت پر یونیورسٹی آئیں یا نہ آئیں، وقت پر یونیورسٹی سے باہر ضرور نکل جاتے ہیں۔اپنے ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی دوسری جگہ نظر آتے ہیں۔اب ہمیں ہی دیکھ لو، آج پہلی کلاس فارغ ملی ہے تو کینٹین میں بیٹھے ہیں ورنہ کہاں وقت ہوتا ہے؟

اسی طرح جو بیچارے مارننگ پروگرام میں داخلہ لینے کے باوجود بھی شام کے پانچ بجے گھر واپس جاتے ہیں، وہ سائنس والے ہیں۔زیادہ تر وقت یہ تمہیں کینٹین میں بیٹھے کچھ نہ کچھ ٹھونستے ہوئے نظر آئیں گے یا پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باغ میں ریکٹ کھیلتے دکھائی دیں گے۔

جو سفید کوٹ پہنے خود کو ڈاکٹر ثابت کرنے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے، سفید مرغیاں لگ رہے ہونگے، وہ فارمیسی والے ہونگے۔ فارمیسی والے پوری جامعہ میں سب سے منفرد ہیں، کیوں کہ جیسے ہی یہ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہیں انکے سفید اوورآل کو دیکھ کر لگتا ہے، جیسے کسی نے مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا ہو اور اس میں سے لاتعداد مرغیاں نکل رہیں ہوں۔

جو بیچارے اول جلول سے حلیے کو فیشن کا نام دیتے ہوئے روز نمونے بن کر آتے ہیں، وہ آرٹس والے ہیں، کبھی یہ اسپیکرز پر گانے لگا کے خود بھی ساتھ ساتھ گا رہے ہوتے ہیں، کبھی گٹار بجا رہے ہوتے ہیں یا کچھ نہیں ملتا تو چھوٹا موٹا ناٹک لگا کر اپنی اداکاری کا شوق پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کچھ کچھ تو کیمرا لیے پورا دن اپنی فوٹو گرافی کا شوق بھی یونیورسٹی میں ہی پورا کر لیتے ہیں۔ عرض، یہ تمام کام کرتے ہیں سوائے پڑھائی کے۔۔۔

اور آخر میں آتے ہیں لٹریچر ڈیپارٹمنٹ والے، انکے یہاں کے لڑکے ہمیشہ شلوار قمیض پر، ایک کندھے پر لیپ ٹاپ بیگ جیسا بستہ ڈالے، جون ایلیا جیسے لمبے بالوں میں نظر آئیں گے۔''اس نے ایک ساتھ پوری جامعہ کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ وہ لوگ ہنسنے کے ساتھ ساتھ اس سے متفق بھی نظر آ رہے تھے۔

''اوئے خبردار!۔۔۔جون ایلیا کا مذاق نہ بنانا'' پاس ہی ایک اور میز پر بیٹھے دو لڑکوں میں سے ایک نے برا منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔یقیناً اس نے انکی گفتگو پوری پوری ملاحظہ کی تھی۔

''میری مجال جو میں ایسا کروں؟ میں تو پہچان کروانے کے لیے کہہ رہا تھا'' مقدم نے جواب دیا۔ وہ دونوں لڑکے انکی کلاس کے ہی تھے، انکے نام ٹھیک سے معلوم نہ تھے ابھی۔

''ویسے کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو، بس میرے دوست کو اردو شاعری سے عشق ہے۔ بھلے سے شاعری ایک بھی صحیح سے یاد ہو نہ ہو، لیکن پھر بھی اسکی محبت میں ذرا کمی نہیں آتی'' اُسکا دوست جو فرائیز کھا رہا تھا، اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''اسی کو تو محبت کہتے ہیں'' حسین نے کہا تو سارے ہنس دیئے، سوائے شاعری کے عاشق کے جو برے برے منہ بنا رہا تھا۔

''ویسے مجھے نوید عالم کہتے ہیں'' فرائیز والے لڑکے نے لگے ہاتھوں اپنا تعارف کروایا۔

''کہتے ہونگے، نام کیا ہے؟ یہ بتاؤ'' مقدم نے کہا تو وہ مسکرایا۔

''نام بھی یہی ہے بھائی''

''اور تمہارا کیا نام ہے؟ بانو قدسیہ؟'' حسین نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔

''علی نام ہے میرا۔۔۔ علی سفیر'' اس نے چبا چبا کر کہا۔ پھر بقایا تعارف کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ سارے ساتھ بیٹھے تھے۔ لگتا نہیں تھا جیسے ابھی ملے ہوں۔

----------+----------+----------

''تم لوگوں کے ناشتے کے چکر میں، ہم سارے لیٹ ہو گئے ہیں کلاس سے'' وہ لوگ بھاگتے بھاگتے ڈیپارٹمنٹ پہنچ رہے تھے، کیونکہ اُنہوں ناشتہ کرنے سائنس ڈیپارٹمنٹ کی کینٹین کا رخ کیا تھا، اب واپسی پر دیر ہو گئی تھی۔

''ہمارے ناشتے نہیں، تمہارے جون ایلیا کی وجہ سے'' عمر نے علی کو جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتا رضا نے دونوں کو ٹوک دیا۔

''اب لڑو تو مت''

''یار! سر کو کیا جواب دیں گے؟'' نوید کو ٹیچر کی فکر ہو رہی تھی۔

''فکر نہ کرو! میں ہوں نہ ساتھ، سنبھال لوں گا''سب سے زیادہ پر سکون حسین تھا۔

''تم ساتھ ہو یہی تو فکر ہے'' رضا نے کہا۔ جب وہ لوگ بھاگتے دوڑتے، گرتے پڑتے، ڈیپارٹمنٹ پہنچے، تو کلاس شروع ہو چکی تھی۔ وہ پیچھے والے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔

''کیا کرنا ہے اب؟''علی نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے، جیسے ہی سر اپنا چہرہ وائٹ بورڈ کی جانب کریں گے۔ ہم جلدی سے جا کر آخری والی رو میں بیٹھ جائیں گے'' حسین نے منصوبہ بتایا۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ غلط ہے''سب سے پہلے عمر کے اندر کا اچھا انسان جاگا تھا۔

''اس نیک روح کو باہر ہی چھوڑ دیتے ہیں اور ہم اندر چلتے ہیں'' مقدم نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو اس نے منہ بسورا۔

''ہم خاموشی سے جا کر اندر بیٹھ بھی گئے تو کیا سر کو کلاس میں ایک ساتھ چھ لوگوں کا اضافہ نظر نہیں آئیگا؟''رضا نے پتے کی بات کی تھی۔

''یار! ایک تو تم لوگ کوئی کام ہونے سے پہلے ہی اُسکا ستیاناس مار دیتے ہو۔ کچھ نہیں ہو گا، حسین! میں تیار ہوں تمہارے ساتھ اندر جانے کو'' نوید نے پہلے عمر اور رضا کو، پھر حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اندر جانے کی نوبت ہی نہ آئی، استاد صاحب نے انکی سرگوشیوں پر نظریں اٹھا کے پیچھے والے دروازے کی جانب دیکھا تو دروازے سے حسین کا چہرہ دکھائی دیا۔

''حسین۔۔۔''انہوں نے اُسے پکارا۔

''مارے گئے''علی نے ناخن چبائے تھے۔

''جی سر؟''اس نے نہایت ہی ادب کے ساتھ، دروازے سے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''سر! دراصل میں اور میرا دوست لیٹ ہو گئے ہیں، تو ہم باہر کھڑے آپکی اجازت کے منتظر ہیں۔''اس نے ادب سے کہا۔

''کون ہے تمہارا دوست ؟''انہوں میں چشمے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''سر یہ۔۔۔''اس نے بنا دیکھے ہاتھ بڑھایا اور جو پہلا بندہ ہاتھ لگا، اُسے ہی اپنے سامنے کر دیا۔

''اوہ! عمر حفیظ۔۔۔ تو تم دونوں لیٹ ہو؟''سر نے بغور دیکھا۔

''نہیں سر! ساتھ میں اِسکا دوست بھی لیٹ ہے''حسین نے کہا تو کلاس میں کھی کھی کی آوازیں آنے لگی۔

''کون ہیں وہ صاحب؟ ذرا آگے کریں اُنہیں بھی''

اب کہ حسین نے بائیں ہاتھ سے نوید کو گدّی سے پکڑا اور اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ خود وہ اُن دونوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

''السلام و علیکم سر!''نوید نے دانت نکالیں۔

''ساتھ میں اِسکا دوست بھی ہے کیا؟''استاد صاحب نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بڑی فرصت سے پوچھا۔

''آپکو کیسے پتہ سر؟''حسین نے حیرت کی انتہا کے ساتھ کہ، تو ایک بار پھر پوری کلاس میں ہنسی کا فوارہ اُبلا تھا۔ جبکہ استاد صاحب نے بھی اپنی مسکراہٹ چھپانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

''انکا دیدار بھی کراؤ''اُنہوں نے فرمائش کی۔

''اب میرا ہاتھ خالی نہیں ہے۔ ایسا کرو تم خود ہی آجاؤ''اس نے علی کی طرف منہ کر کہ کہا، پوری کلاس اپنے اپنے چہرے پیچھے موڑے آنے والے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ یہاں سے اُنہیں باقی تینوں نظر نہیں آرہے تھے۔ علی اُسے گھورتا ہوا کلاس کے اندر داخل ہوا اور ایک جانب کھڑا ہو گیا۔

''تم چار ہی ہو یا اور بھی ہیں؟''اُنہوں نے تصدیق کرنی چاہی۔

''سر! ایسا ہے کہ ہم دونوں (انگلی سے عمر اور خود کی طرف اشارہ کیا) کے ایک ایک دوست اور بھی ہیں''اب کے وہاں قہقہ گونجا تھا، اور ان قہقہوں میں استاد صاحب نے دوبارہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے مقدم اور رضا نے جھانکا۔

''آجائیں اندر آپ دونوں بھی''اُنہوں نے،اُنہیں بھی دعوت دی۔اب وہ سارے ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔

''تو بتانا پسند کرینگے آپ لوگ کہاں تھے؟''اُنکے پاس آج کافی فرصت تھی۔

''سر! ہم کینٹین میں تھے''کسی کے بھی کچھ بھی کہنے سے قبل ہی عمر بول پڑا۔ باقی پانچوں نے اُسے ایک ساتھ گھورا تھا۔ کیا تھا جو کہہ دیتا کہ ہم لائبریری میں بیٹھے پڑھ رہے تھے؟لیکن نہیں،جناب کو اپنے ضمیر کے آگے شرمندہ نہیں ہونا تھا۔

''سر! وہاں سے آنے میں دیر ہو گئی''مقدم نے بات کو ذرا سا گھمایا۔

''وہ کیسے؟''وہ لگتا تھا آج چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''سر! ہم آرہے تھے کہ راستے میں ایکسڈنٹ ہو گیا''مقدم نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے؟''اب کہ وہ واقعی پریشان ہوئے تھے۔

''ہم وہی معلوم کرنے تور کے تھے''مقدم نے بے ساختہ کہا تو کلاس میں ایک بار پھر ہنسی کا طوفان اٹھا تھا۔استاد صاحب نے ساروں کو گھورا۔

''انسان بن جاؤ تم لوگ،یہ پہلی بار ہے اس لیے چھوڑ رہا ہوں۔دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے''انہوں نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے اُنہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا،تو وہ لوگ بھی اچھے بچوں کی طرح پیچھے والی رو میں ساتھ ہی بیٹھ گئے۔آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

----------+----------+----------

''تو تم اکلوتے ہو؟''مقدم نے آخری سموسہ پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے،علی سے پوچھا تھا۔

''ہاں!''اُس نے کیچپ میں فرائیز ڈبوتے ہوئے جواب دیا۔

''اکلوتا ہونا بھی ویسے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے''عمر نے رشک سے کہا۔

''یہ تمہارا تجربہ ہے یا تجزیہ؟''مقدم نے پوچھا۔

''مشاہدہ''اس نے جواب دیا۔

''بہت غلط مشاہدہ ہے تمہارا، مجھ سے پوچھو ذرا، میں تو کہتا ہوں کہ بندہ کھوتا (گدھا) ہو مگر اکلوتا نہ ہو''علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اور جو دونوں ہو؟''حسین نے پوچھا۔

''اُسے علی کہتے ہے''مقدم نے فقرہ مکمل کیا تو وہاں قہقہہ پڑا۔

''شٹ اپ!''علی نے بہت ہی سڑا ہوا منہ بنایا تھا۔ تین ہفتے ہو گئے تھے اُن سب کو ایک دوسرے کے ساتھ۔ کافی حد تک ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہونے کے بعد آج تفصیلی تعارف کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

''تم بتاؤ نوید؟''

''میں ایڈاپٹیڈ (لے پالک) ہوں''اس نے کہا تو ایک لمحے کو سب خاموش ہوئے۔

''میرے کہنے کا مطلب مڈل چائلڈ ہوں''اُن سب کو سنجیدہ دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''حد ہے بھئی۔۔۔''

''مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن''اس نے تعارف مکمل کیا۔

''میرے ایک ابّو اور ایک امی ہیں''حسین نے درمیان میں اپنے تعارف شروع کر دیا تھا۔

''سب کے ایک ہی ہوتے ہیں''علی نے جیسے اُسے سمجھایا تھا۔

''سب کے ایک نہیں ہوتے، میری دو امیاں ہیں''مقدم نے بیچ میں کہا۔

''کیسے؟''

''ابّا نے دو شادیاں کر رکھی ہیں، ایک یہاں اور ایک سوات میں، مزے کی بات یہ ہے کہ وہاں بھی انکا ایک بیٹا ہے۔ مجھ سے چار ماہ بڑا''اس نے بتایا۔

''مطلب تم اکلوتے نہیں ہوئے؟''نوید نے پوچھا۔

''کہہ سکتے ہو''

''یعنی علی اکلوتا کھوتا ہے؟''حسین نے پوچھا تو کافی سنجیدگی سے تھا، لیکن ایک بار پھر، وہاں قہقہہ زوروں کا پڑا تھا۔ علی نے اُسے تھپڑ بھی کافی زور کا ہی رسید کیا تھا۔

''اور رضا تم بتاؤ؟''عمر نے کافی دیر سے خاموش رضا کو مخاطب کیا۔اُنکی گفتگو کے دوران وہ ایسے ہی خاموش رہتا تھا کہ کبھی کبھار اُسکی وہاں موجودگی کا بھی احساس نہ ہوتا۔

''میں اکیلے رہتا ہوں''

''گھر والے کہاں رہتے ہیں؟''

''کینیڈا''

''تم ساتھ کیوں نہیں رہتے؟''

''وہ رکھنا نہیں چاہتے''اس نے کہا تو آہستہ تھا لیکن سناسب نے تھا۔اور یہ اُسکی پہلی غلطی تھی،اُس نے نہ جانے کیسے یہ کہہ دیا؟

''کیوں؟''نوید کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''پتہ نہیں''اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے جھک کر سموسے کی پلیٹ اٹھائی، صاف نظریں چرائیں۔اس سے آگے کسی نے کچھ نہ پوچھا، اتنی اخلاقیات تو تھیں اُن میں کہ اگر وہ نہیں بتا رہا تو وہ بھی نہ پوچھیں۔

''میرا ایک بھائی ہے، مجھ سے ایک سال چھوٹا۔اور میرا سب سے اچھا دوست بھی وہی ہے''عمر نے ماحول میں چھائے بوجھل پن کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''اور میرے چار بھائی ہیں۔اور سارے میرے دشمن، ایک آنکھ نہیں دیکھنا چاہتے مجھے''یہ حسین تھا۔

''حرکتیں ہی ایسی ہیں تمہاری، ناک میں دم کر کے رکھتے ہو گے تم سب کی'' علی نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔

''میں سب سے چھوٹا ہوں نا اور اپنے ماں باپ کا لاڈلہ اسی لیے جلتے ہیں سارے مجھ سے'' اس نے مصنوعی مظلومیت چہرے پر سجاتے ہوئے کہا، جسکا کسی نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔

اس دن کے بعد وہ لوگ ہر جگہ ساتھ ہی پائے جانے لگے تھے۔ لائبریری میں ساتھ، کینٹین میں ساتھ، کلاس میں ساتھ، گروپ ٹاسک میں ساتھ، کھیل میں ساتھ عرض وہ جہاں ہوتے، ساتھ ہی ہوتے تھے۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ وہ اپنا گینگ بنا کر چل رہے ہیں۔

----------+----------+----------

اتوار صبح دس بج کر تین منٹ، مورخہ چھ جنوری:

اور آج پورے دس سال بعد وہ یہاں تھا، اُسکی نظروں کے سامنے، بہت سے سوال تھے اس کے پاس کرنے کو، لیکن کیسے کرتا؟ اور کیا پوچھتا؟ دس سالوں کا فاصلہ تھا درمیان میں۔۔۔ وہ بدل گیا تھا۔ بہت بدل گیا تھا۔ کتنی خاموشی تھی اُسکے چہرے پر، کتنی سنجیدگی۔۔۔۔ آخر کیا ہوا تھا اُسکے ساتھ؟ کہاں چلا گیا تھا وہ؟ یہ اُسکا مقّی تو نہیں تھا، یہ تو مقدم شفیق تھا۔ ایک کامیاب بزنس مین، عمر نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس سے کوئی سوال نہیں کریگا۔

یہ بھی بہت تھا کہ وہ اسے پہچانتا تھا۔

یہ بھی بہت تھا کہ وہ اسے بھولا نہیں تھا۔

اور یہ بھی بہت تھا کہ عمر نے اپنی زندگی میں اُسے صحیح سلامت دیکھ لیا تھا۔

کمرے میں دو نفوس کے موجود ہونے کے باوجود بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن کہتے تو کیسے؟ زبان ساتھ دینے سے انکاری تھی۔ فضاء میں چھائے اس سکوت کو دروازے کی چڑچڑاہٹ نے توڑا تھا۔ آواز پر دونوں ہی نے سر اٹھا کر دیکھا تھا لیکن آنے والے کی نظر سب سے پہلے دروازے کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھے عمر پر گئی تھیں۔

''عمر!۔۔۔ تم یہاں؟''صوفے پر اُسکے برابر بیٹھتے ہوئے،اس نے حیرت سے پوچھا تھا، جبکہ خود عمر کی حیرت زدہ نظروں میں بھی یہی سوال تھا۔

''مجھے کسی کیس کی تفتیش کے لیے بلایا گیا ہے''اس نے کہا۔

''مجھے بھی''اس نے سر ہلاتے ہوئے کہااور اسی لمحے اُسکی نظریں مقدم تک گئی تھیں۔اس نے حیرت سے عمر کو دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ یہاں کیسے ؟لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔کیسے دیتا؟ وہ خود کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ابھی کچھ ہفتے پہلے بھی وہ تینوں ایک ساتھ تھے۔ پورے دس سال بعد اور یقیناً اُس ملاقات کا مقدم کو اب تک علم نہ تھا۔ہوتا تو وہ کچھ جتاتا ضرور، یا شاید جان کر انجان تھا۔

اور آج؟آج وہ تینوں پھر ساتھ بیٹھے تھے۔کیوں؟ کس لیے؟ کسی کے پاس جواب نہ تھا۔مقدم کی نظریں اٹھی تھیں اور اسی لمحے علی نے بھی اُسے دیکھا،دونوں کی نظریں ملیں۔بہت دیر خاموشی چھائی رہی جیسے دونوں ہی بات کے آغاز کے لیے الفاظ تلاش رہے ہوں۔

''کیسے ہو مقدم؟''بلآخر اس نے خود ہی سوال کیا تھا۔

''میں ٹھیک۔۔ تم کیسے ہو؟''اس نے ہلکے سے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں''اس نے رسمی سے انداز میں جواب دیا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا،اُسکی نظریں بلاارادہ ہی عمر تک گئی اور واپس پلٹنا بھول گئی۔ عمر اُسے ہی دیکھ رہا تھا یا شاید جانچ رہا تھا۔اُسکی ایک ہی نظر نے علی کو اندر تک ہلا دیا تھا۔کیا کچھ نہیں تھا اُسکی نظروں میں؟ ملامت،تاسف،افسوس اور شاید طنز بھی۔۔۔کہ یہ تم پوچھ رہے ہو علی؟ تم؟ کس منہ سے اُسکا حال احوال دریافت کر رہے ہو؟ غیر محسوس انداز میں علی کا چہرہ جھک گیا تھا۔

اُن رسمی سے جملوں کے تبادلے کے بعد،اُن تینوں کے درمیان اور کوئی بات نہ ہوئی۔ علی کی نظریں نیچے ماربل کے فرش پر ٹکی تھیں۔اس نے دانستہ نگاہیں دوبارہ نہیں اٹھائی تھیں،شاید ڈر تھا کہ کہیں دوبارہ سامنا عمر سے نہ ہو جائے،وہ اُسکی ملامتی نظریں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ماربل کے فرش پر مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ڈیزائین بنے تھے۔اُن پتھروں میں اُسے بہت سارے مناظر اُبھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ بہت ساری شناسا آوازیں اس خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مناظر اور آوازیں پورے کمرے میں چھانے لگے۔

وہ سب کہیں غائب ہونے لگے اور علی، عمر اور مقدم اُن مناظر کا حصہ بن گئے۔

----------+----------+----------

چودہ سال پہلے:

''یار میں کیا کروں؟ کوئی مجھے سنجیدہ لیتا ہی نہیں گھر میں''اس نے کوئی ساتواں کباب اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے دکھ سے کہا تھا۔ عمر ایک کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹکائے، اُسی ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنا دایاں گال رکھے، پوری سنجیدگی سے اُسکی دکھی داستان سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان کبابوں پر فاتحہ بھی پڑھ رہا تھا، جو اُسکی آنکھوں کے سامنے سے مقدم کی پلیٹ میں اور پھر وہاں سے سفر کرتے ہوئے اُسکے پیٹ تک گئے تھے۔ مقدم صاحب پر تازہ تازہ عشق کا بھوت سوار ہوا تھا، اپنی کزن لیلیٰ سے اور کزن بھی وہ جسکی ماں سے مقدم کی امّاں کو خدا واسطے کا بیر تھا۔اُسے تو اپنی داستان شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''تم بتاؤ مجھے کہ میں کیا کروں؟''اُس نے کوئی ایک ہزار اکیسویں مرتبہ پوچھا تھا، کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

''بتایا تو ہے کہ گھر میں بات کرو''عمر نے آٹھواں کباب اُسکی پلیٹ میں جاتے دیکھ کر ضبط کے گھونٹ بھرے تھے۔

''کی تھی بات، ابّا تو بخوشی راضی ہیں کہ لیلیٰ انکی اکلوتی بھتیجی ہے۔ لیکن جیسے ہی امّاں سے بات کرنے گیا اس سے پہلے ہی انہوں نے اپنی نند پلس میری پھوپھو اور مستقبل کی ساس، کے ظلم و ستم کی وہ داستان سنائی کہ میں نے اپنا فیصلہ ہی ملتوی کر دیا''نواں کباب

''کیا تمہاری پھوپھو واقعی بہت ظالم ہیں؟''

''نہیں یار! ایسی بات نہیں ہے۔ میری امّاں کی شروع دن سے ہی میرے ددھیال والوں سے نہیں بن سکی بلکہ اُنہیں ہر وہ انسان اچھا لگتا ہے، جو انکے سسرال کے خلاف ہو''دسواں کباب۔

''تم سب سے پہلے لیلیٰ سے بات کر کے دیکھو، پہلے اُسے تو معلوم ہو کہ تم اُسے پسند کرتے ہو''

''اُسے معلوم ہے''

''کیا واقعی؟''عمر سیدھا ہو بیٹھا، یہ نیا انکشاف تھا۔

''ہاں! اور اُسکی امّاں یعنی میری پھوپھو بھی، مجھے اتنا ہی ناپسند کرتی ہیں جتنا کہ میری امّاں لیلیٰ کو''

''واہ بھئی! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے''عمر نے کہا تو وہ مسکرایا۔

''خیر! اب کسی طرح امّاں کو راضی کرنا ہے''اس نے پریشانی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''کہو تو اور کباب منگوا دوں؟''عمر نے اچانک ہی پوچھا۔

''کیا؟''اس نے ناسمجھی سے پوچھا، پھر خالی پلیٹ پر نظر پڑتے ہی خجل ہوا۔

''لگتا ہے میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہوں''

''نہیں! زیادہ نہیں، بس دس کباب ہی تھے''اس نے اطمینان سے کہا۔

''بدتمیز آدمی! میرے نوالے گن رہے تھے تم؟''وہ چلایا۔

''جب اپنے نوالے نہیں ملے تو نظریں خود بخود تمہارے نوالوں پر چلی گئیں''اس نے مزے سے کہا تو مقدم نے اُسے گھورا۔

''چلو یار! بہت دیر ہو گئی ہے اب میں چلتا ہوں''اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''برا تو نہیں مان گئے؟''''عمر نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''تمہاری باتوں کا میری جوتی بھی برا نہیں مانتی، میں پھر آؤنگا اور اگلی بار آنٹی سے دس کی جگہ بیس کباب فرائی کروا کے کھاؤں گا۔ بے شک تم بیٹھے گنتے رہنا''وہ ڈھٹائی سے کہتے ہوئے کھڑا ہوا تو عمر ہنس دیا۔ آج وہ اُسکے گھر آیا تھا، ہمیشہ کی طرح اپنے اور لیلیٰ کے مسئلے کا کوئی حل نکالنے، مگر آج کا دن بھی بے سود گیا تھا۔ کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑا تو عمر نے اچانک ہی اُسے آواز دی۔

''آغا۔۔۔'' وہ اکثر اُسے آغا کہہ کر پکارتا تھا، اور ایسا صرف وہی کرتا تھا۔ باقی ساروں نے تو اس کے نام کو توڑ مروڑ کر مقدم سے مقّی بنا دیا تھا۔

''ہاں؟'' وہ رکا۔

''پریشان نہیں ہونا، کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا'' اس نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔ اُسکا یہ دوسروں کی فکر کرنے والا مزاج ہمیشہ سے اُسے ہر دل عزیز بناتا تھا۔

''جو کام آپکا بھائی کر نہیں سکتا، اُسکے لیے کبھی حامی نہیں بھرتا اور ایسا ہوا ہے کبھی، کہ جو کام میں کرنے کی ٹھان لوں وہ ادھورا چھوڑ دوں'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ مسکراتا تھا تو اُسکی آنکھیں بھی ساتھ مسکراتی تھیں۔ عمر نے نفی میں سر ہلایا اور ہنستے ہوئے اُسکے گلے لگ گیا۔

----------+----------+----------

شام کا وقت تھا، وہ کرکٹ میچ جیت کر، گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی باغیچے میں چادر بچھائے خضر پش اپس لگاتا نظر آیا۔

''کچھ نہیں ہونا ان پش اپس سے، وزن تمہارا ایک انچ بھی کم نہیں ہونا'' عمر نے اُسکے پاس آتے ہوئے اُسے چھیڑا۔

''کالے ہو جاؤ میری فٹنس سے جل جل کے'' اس نے ورزش کے بیچ میں ہانپتے ہوئے کہا۔

''کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں'' عمر نے مزید دل جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''دل والے سے یاد آیا، آپکی جولیٹ صبح سے چھ مرتبہ گھر کے چکر لگا چکی ہیں'' اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''معلوم نہیں، مجھے نہیں بتا رہی، کہتی ہے میرا رومیو آئیگا تو اُسے ہی بتاؤنگی'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ڈمبل اٹھا لیے۔

''کوئی اہم بات ہو گی'' عمر نے سوچتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں لان کے برابر والی دیوار سے کسی کا سر نمودار ہوا۔

''لو!۔۔۔شیطان کا نام لیا اور اُسکی خالہ حاضر''خضر نے ساتھ والی دیوار سے جھانکتی عمارہ پر چوٹ کی تھی۔دونوں گھر کے لان کی دیواریں جڑی ہونے کے باعث، وہ اکثر یہیں سے رابطہ کر لیا کرتی تھی۔

''تم چپ کرو''اس نے خضر کو گھورا تو وہ شرافت سے دونوں ہاتھوں سے ڈمبلز پکڑے ورزش کرنے لگا۔

''اور تم کہاں تھے صبح سے؟''اب اُسکا رخ عمر کی جانب تھا۔

''یونیورسٹی میں۔''کرکٹ والی بات نہیں بتائی۔

''وہ تو مجھے بھی پتہ ہے لیکن شام کے چھ بج رہے ہیں۔اتنی دیر تک کیا کر رہے تھے یونیورسٹی میں؟تمہارا تو ڈیڑھ بجے آف نہیں ہو جاتا؟''
اس نے مشکوک نظروں سے پوچھا تو وہ لمحے بھر کو گڑبڑایا۔جبکہ خضر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''ابھی سے شروع ہو گی تفتیش، سوچ لے بھائی!ابھی بھی وقت ہے، ورنہ ساری زندگی ایسے ہی جواب طلبی ہوتی رہے گی''

''تم چپ کرو''اس نے پہلے خضر کو کہا اور پھر عمارہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''یار!میرا ففتھ (پانچواں) سیمسٹر چل رہا ہے۔دیر سویر ہو جاتی ہے۔کام بھی زیادہ ہوتا ہے آج کل''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا جب ایک بجے آف ہو گیا تھا، تو میں تمہارے ڈیپارٹمنٹ آئی تھیں، تم سے بات کرنے، مجھے حسین ملا اور اس نے بتایا کہ تم اور تمہارا جگری یار مقدم ریسٹورنٹ گئے ہوئے ہو کھانا کھانے''عمر کی سیٹی گم ہو گئی۔

''نہیں وہ۔۔۔اصل میں''اُس سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔

''تمہیں میں نے صبح کہا بھی تھا کہ ضروری بات کرنی ہے، لیکن نہیں جناب کو یاد ہی نہیں تھا۔جاؤ جا کر اپنی دوستیاں نبھاؤ''غصّے سے کہہ کر جانے کے لیے مڑی۔

''ارے۔۔۔عمارہ رکو تو''اس نے پیچھے سے کہا۔حسین کو تو وہ بعد میں پوچھے گا۔

''مجھ سے قسم لے لو، میں اور آغا پیپر زپرنٹ کروانے گئے تھے۔ حسین کو تو عادت ہے مذاق کرنے کی''اِس بات پر وہ واپس مڑی اور خفگی سے اُسے دیکھنے لگی۔

''لیکن تم گئے تو تھے ناحالانکہ میں نے آج تم سے ضروری بات کرنی تھی''

''اس وقت تم دونوں رومیو جولیٹ کے بجائے میاں بیوی لگ رہے ہو''خضر کی زبان پھر پھسلی تھی۔

''بار بار یہ رومیو جولیٹ کہنا بند کرو،اُن دونوں کے بیچ میں سماج کی دیواریں تھی۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے''عمر نے اُسے بتایا۔

''دیوار تو ہے بیچ میں''اس نے کہااور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

''بتاؤ کیا بات کرنی تھی؟''اس نے خضر کو نظر انداز کرتے ہوئے عمارہ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں !اب بتادو وہ بات جسکی خاطر صبح سے دس بار گھر آکر پکوڑے اور کباب کھا چکی ہو''اُسکے جواب دینے سے پہلے ہی خضر صاحب کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔

''میں دس بار آؤں یا سو بار تمہیں کیا تکلیف ہے؟''اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے لڑاکا انداز میں پوچھا۔

''جب سے پیدا ہوئی ہو ہمارے گھر میں ہی پھرتی رہتی ہو، مجھے تکلیف نہیں ہو گی تو کس کو ہو گی؟''اُدھر سے بھی دوبدو جواب آیا تھا۔

''تم چھوڑو اس پاگل کو، مجھے بتاؤ کیا ضروری بات تھی؟''عمر نے اس لایعنی بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

''پہلے اپنے ذلیل بھائی کو ہٹاؤ یہاں سے، اسکے سامنے نہیں بات کرنی مجھے''

''کیوں؟ایسے کونسے عہد وپیمان ہیں جو میرے سامنے نہیں ہو سکتے؟ میں تو نہیں جا رہا کہیں''وہ بھی عمر کے کندھے پر بازو ٹکاتے ہوئے، وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

''بد تمیز!''عمارہ نے بس اتنا ہی کہا پھر عمر کی جانب متوجہ ہوئی۔

''عمر! میرا نا، رشتہ آیا ہے''اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے مسئلہ بیان کیا۔ دوسری جانب خضر پانی کی بوتل منہ سے لگائے انکی گفتگو ملاحظہ کر رہا تھا۔

''وہ تو پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ تم منع کر دو''عمر نے فوراً سے حل پیش کیا۔

''میں اور کتنی بار منع کروں؟ میرے ماں باپ بھی اب مجھ سے ناراض ہونے لگے ہیں۔ اور اس بار تو میں انکار نہیں کر سکتی وہ میری پھوپھو کا بیٹا ہے''

''لو بھئی۔۔۔ ایک تو یہ پھوپھو کا بیٹا ہمیشہ آجاتا ہے رنگ میں بھنگ ڈالنے''خضر نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یار! میری پوزیشن بھی تو سمجھو ابھی میری تعلیم چل رہی ہے، اس وقت میں گھر میں اپنی شادی کی بات کیسے کر سکتا ہوں؟''عمر نے بیچارگی سے کہا۔

''شادی کی نہیں رشتے کی بات تو کر سکتے ہو نا؟ میں کچھ نہیں جانتی عمر، اس بار تمہاری طرف سے ہی کوئی بات ہو گی، تب ہی میں اپنے گھر والوں کو منع کر سکتی ہوں۔ ورنہ تم بیٹھے رہو اور ہو جانے دو میری منگنی کسی اور سے''وہ غصّے سے کہتی دیوار کے پیچھے گم ہو گئی اور وہ بیچارہ "ارے ارے"ہی کرتا رہ گیا۔

''لو! آگئی سماج کی دیوار''خضر نے ہنستے ہوئے اُسکے کندھے پر ہاتھ مارا تو عمر نے اسے گھورا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔

''اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا''خضر نے کہتے ہوئے دوبارہ پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

-----------+-----------+----------

''ریسرچ پیپرز پرنٹ کروالیئے؟''عمر نے رضا سے پوچھا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے باہر بیٹھے تھے۔ انکے امتحانات تھے، لہٰذا ریسرچ ورک زور و شور سے جاری تھا۔

''کہاں یار؟ صبح سے باقی چاروں کے کام کو کمپائل (مرتب) کر رہا تھا۔ وقت ہی نہیں مل سکا''اس نے لیپ ٹاپ پر انگلیں چلاتے ہوئے، مصروف سے انداز میں کہا۔

''اوہو، چلو پھر تم بیٹھو میں سامنے اسٹیشنری سے پیپر زپرنٹ کروا کر آتا ہوں'' وہ کھڑا ہوا۔

''یو ایس بی ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں!'' وہ کہہ کر ڈیپارٹمنٹ سے باہر آیا، سامنے سڑک کی دوسری جانب ہی مینجمنٹ سائنس والوں کی اسٹیشنری تھی۔ وہ سڑک پار کر کے اسٹیشنری کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا، کہ جب ہی اچانک ایک لڑکا اس سے بری طرح ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ عمر اس سے معذرت کرتا یا کچھ کہتا وہ بنا رکے اُسی انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

''رکو! بات تو سنو۔'' عمر نے اُسے پکارا، مگر وہ نہ رُکا۔ اُسی وقت ایک دوسرا لڑکا خاصی عجلت میں اُسکے پاس آیا اور شرمندہ لہجے میں بولا۔

''سوری یار! میرا دوست دیکھ نہیں سکتا ہے، ہمیشہ میں اُسکے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ ابھی ذرا پیچھے رہ گیا تھا تو وہ خود ہی چل پڑا'' وہ لڑکا کہہ کر عمر کا جواب سننے کے لیے رکا نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ عمر کتنی ہی دیر حیرت زدہ سا وہاں کھڑا رہا تھا۔ پچھلے ڈھائی سالوں میں اُس نے جامعہ میں بہت سارے معذور افراد دیکھے تھے، جو اپنی معذوری کو پس پشت ڈالے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مگر کسی نابینا طالب علم سے اُسکا پہلی بار سامنا ہوا تھا۔

''پھر ہم کس بات پر ناشکرا پن کرتے ہیں؟'' اس نے سوچا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پیپر زپرنٹ کروا کر دوبارہ وہیں آ بیٹھا، جہاں رضا تو پہلے سے ہی موجود تھا مگر اب وہاں نوید کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ اس نے پیپر ز نوید کے حوالے کیے جو پہلے سے ہی کچھ کاغذات فائل میں ترتیب دے رہا تھا۔ خود وہ خاموشی سے وہیں بیٹھ گیا۔ خیالوں کی رو بھٹک کر اُسی لڑکے تک جا پہنچی تھیں۔ نوید نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا اور پھر مصروف سے انداز میں اس سے پوچھا۔

''تمہیں کیوں خاموشی کے دورے پڑ گئے آج؟''

''ایک لڑکے کو دیکھا ابھی، وہ دیکھ نہیں سکتا مطلب نابینا ہے۔ اسی یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ ہے''

''اُسکے ساتھ ایک اور لڑکا بھی ہو گا، جو اُسکا دوست ہو گا اور اُسے سہارا دے کر لے جا رہا ہو گا'' نوید نے پوچھا، نظریں اُسکی البتہ فائل اور کاغذات پر ہی تھیں۔ وہ حیران ہوا۔

''تم جانتے ہو؟''

''ہاں!۔۔۔وہ نواز ہو گا یقیناً''اُس نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''تم کیسے جانتے ہو اسے؟''عمر حیران ہوا۔

''ہمارے پوائنٹ میں آتا ہے، انگلش لٹریچر (انگریزی ادب) میں آنرز کر رہا ہے''

''لوگ کیسی کیسی آزمائش میں ہیں''اس نے ہلکے سے کہا، تو اتنی دیر میں پہلی بار رضا نے انظریں اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔اُسکی ہر ایک کے لیے فکر مند ہونے والی عادت نے اُسے ہمیشہ پریشان ہی رکھنا تھا۔

''آزمائش تو ہے لیکن اسکا دوست، جو اُسکے پڑوس میں رہتا ہے۔وہ اُسے ساتھ لے کر آتا ہے اور سارا دن ساتھ ہی رہتا ہے اُسکے۔بہت اچھا انسان ہے۔نواز سے میری جب بھی بات ہوئی ہے، وہ ہمیشہ ہی اُسکی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آج میں پڑھ پا رہا ہوں تو یہ صرف میرے دوست کی سپورٹ ہے۔''نوید نے تفصیل سے بتایا۔

''کتنے اچھے لوگ موجود ہیں دنیا میں، مجھے خوشی ہوتی ہے اُن لوگوں کو دیکھ کے جو بنا کسی رشتے کے بے لوث ہو کر دوسروں کے لیے جیتے ہیں''عمر نے تعریف کی۔

''واقعی۔۔۔''نوید نے اُسکی بات سے اتفاق کیا تھا۔

''کوئی بے لوث نہیں ہوتا کسی کے لیے بھی، سگے رشتے نہیں ہوتے تو غیر کیسے ہونے لگے؟سب کا اپنا مفاد ہوتا ہے کہیں نہ کہیں''لیپ ٹاپ پر سر جھکائے رضا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔اُن دونوں نے اُسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو، اُسکے بعد خاموشی سے سر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔رضا اکثر اوقات ایسی ہی کوئی تلخ بات کہہ دیتا تھا، جس سے اگر وہ اختلاف کرتے بھی تو اُسکے پاس، خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بہت سے جواز موجود ہوتے تھے۔عام حالات میں وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا، لیکن اس ایک موضوع پر وہ بحث کر لیتا تھا۔اب تو وہ عادی ہو چکے تھے اس چیز کے، لہٰذا خاموش ہی رہے۔

''تم بتاؤ، گھر والوں سے بات کی عمارہ کے لیے؟''نوید نے گفتگو موضوع ہی بدل دیا۔

''ابھی نہیں کی،ذرا ریسرچ سے فارغ ہو جاؤں پھر موقع دیکھ کر بات کرتا ہوں'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ عمارہ کے ذکر پر تو وہ گھنٹوں بات کر سکتا تھا، لیکن ابھی اُسکا خود کا دل اداس ہو گیا تھا۔اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ رضا اتنا نالاں کیوں ہے دنیا سے؟ رشتوں اور انسانیت سے اُسکا اعتبار کیوں اٹھ گیا تھا آخر؟ ایسا کیا کیا ہے زندگی نے اُسکے ساتھ؟ لیکن وہ تھا کہ کچھ بتاتا ہی نہ تھا۔

''چلو بیسٹ آف لک (اچھی قسمت ہو)''نوید نے خوش دلی سے کہا تو اس نے بس مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

----------+----------+----------

''مجھے سمجھ نہیں آرہی کیا کروں؟''عمر پریشانی سے اُسکے برابر آ بیٹھا۔

''عجیب ہی کوئی چول انسان ہو تم'' برابر میں نیم دراز خضر نے سلاد کھاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جسے تم حل ہی نہیں کر پا رہے''اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''عمارہ کا رشتہ آیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ بڑا مسلہ نہیں ہے؟''وہ حیران ہوا۔

''مسئلہ تم بنا رہے ہو۔امی ابّو سے بات کرو، وہ عمارہ کا رشتہ لے کر جائیں۔ یہاں سے انکار ہو گا نہ وہاں سے''

''لیکن اس وقت کیسے بات۔۔۔۔''

''اس وقت نہیں کرو گے تو کب کرو گے؟ یار! ہمارے ماں باپ کب سے اتنے کنزرویٹو (قدامت پسند) ہو گئے ہیں کہ اتنی سی بات کا برا منالیں؟''اس نے عمر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم کہہ تو ٹھیک رہے ہیں لیکن۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، میں رات تک کا الٹی میٹم دے رہا ہوں۔ آج ہی بات کرو ورنہ میں جا کر بتا دونگا۔ تم اپنی انسکیورٹیز (عدم تحفظات) کی وجہ سے اپنی اور عمارہ دونوں کی زندگی برباد کرو گے''وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں جا رہا ہوں رات تک کوئی عملی پیشرفت نظر نہ آئی نا مجھے، تو جان سے مار دونگا تمہیں'' وہ اُسے دھمکاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ اُسکے جانے کے بعد عمر کافی دیر اُسکی باتوں پر ہی غور کرتا رہا۔ عمر دوراندیش تھا اور خضر آج اور ابھی کرنے کا قائل۔ لیکن یہاں وہ ٹھیک تھا، عمر کو لگتا تھا کہ اس وقت شادی کی بات کرنے پر والدین برا نہ مان جائیں حالانکہ وہ ایسے نہیں تھے۔ اور اپنی غلط فہمیوں میں وہ اپنے اور عمارہ کے بیچ میں واقعی خود ہی سماج کی دیوار کا کردار ادا کر رہا تھا۔

''خضر ٹھیک کہہ رہا ہے'' بلآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

-----------+-----------+----------

''حسین کہاں ہے؟'' وہ کلاس میں بیٹھا، اپنا اسائنمنٹ فائل میں لگا رہا تھا، جب علی تن فن کرتا وہاں داخل ہوا۔ پروفیسر صاحبہ نے بنا بتائے چھٹی کر لی تھی، اب وہ سب کلاس میں ہی فارغ بیٹھے تھے، کچھ طلبہ جامعہ کی کینٹین چلے گئے تھے۔ کچھ اگلی کلاس نہ ہونے کے باعث گھر چلے گئے تھے اور بقایا کلاس میں ہی بیٹھے اپنا نامکمل کام مکمل کر رہے تھے، جن میں ایک مقدم بھی تھا۔

''وہ تو گھر چلا گیا ہے۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

''یہ مارا جائیگا کسی دن میرے ہاتھوں'' اس نے ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' مقدم حیران ہوا۔

''اُس بدتمیز نے میرا اور رضا کا بیگ تبدیل کر دیا''

''ہیں؟۔۔۔ پر کیسے؟ تم دونوں کے بیگز میں تو زمین آسمان کا فرق ہے'' وہ حیران ہوا۔

''ارے؟ بیگ نہیں، بیگ میں رکھا سامان تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے ابھی بیگ کھول کر دیکھا، بیگ تو میرا ہی ہے لیکن سامان سارا رضا کا ہے''

''ہاہاہا۔۔۔'' مقدم دل کھول کر ہنسا تھا۔ علی نے اُسے گھورا۔

''اب تو رضا بھی گھر چلا گیا ہے۔ اگلے دو دن چھٹی ہے۔ اب پیر کو ہی اپنا سامان واپس لینا اُس سے'' آج جمعہ تھا اور اب پیر کے دن ہی جامعہ آنا تھا۔

''یقیناً اس نے اپنا بیگ کھول کر نہیں دیکھا ہو گا ورنہ اُسے پتہ چل جاتا۔ اب میں کیا کروں؟'' وہ پریشان سا اُسکے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا کرو گے؟ کہا تو ہے کہ پیر کو لے لینا''

''اُس میں میری کتابیں ہیں، جس سے مجھے اسائنمنٹ بنانا ہے اور وہ پیر کو جمع ہو گا'' اصل مسئلہ اب بتایا۔

''تو پھر ایسا کرو رضا کے گھر چلے جاؤ'' اُس نے حل پیش کیا۔

''اُسکا گھر نہیں معلوم مجھے، میں کبھی گیا ہی نہیں۔ جب بھی ملاقات ہوئی ہے، یونیورسٹی میں یا حسین کے گھر ہی ہوئی ہے''

''ہاں! ویسے اُسکا گھر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ایسا کرو حسین کے گھر چلے جاؤ''

''اُسکے گھر گیا نا تو یقین مانو قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں ایک'' اس نے کہا۔ رہ رہ کر حسین پر غصّہ آ رہا تھا۔ مقدم ایک بار پھر سے ہنسا اسی اثناء میں نوید وہاں داخل ہوا۔

''کہاں تھے تم؟ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں میں تمہیں۔ گھر نہیں چلنا کیا؟'' اس نے علی سے پوچھا۔

''ابھی اسکو حسین کے گھر لے جاؤ۔'' مقدم نے کہا تو وہ حیران ہوا۔

''کیوں؟'' جواب میں اس نے سارا قصہ اُسکے گوش گزار کر دیا، تو وہ بھی ہنس دیا۔

''یہ ہنسنے والی بات نہیں ہے۔ مجھے بہت غصّہ آ رہا ہے'' وہ شدید تپا ہوا تھا۔

''رضا کا آئی ڈی کارڈ ہے بیگ میں؟'' نوید نے پوچھا۔ وہ لوگ جامعہ کا آئی ڈی کارڈ گلے میں ڈالنے کے بجائے، زیادہ تر بیگ میں ہی رکھتے تھے، ضرورت پڑنے پر ہی باہر نکالتے۔

''سب کچھ ہی رضا کا ہے اس بیگ میں'' اس نے چڑ کر کہا تو اُن دونوں نے اپنی اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

''تو آئی ڈی کارڈ نکال کے دیکھو، اس میں گھر کا پتہ لکھا ہوتا ہے''

''ارے ہاں! مجھے کیوں خیال نہیں آیا اسکا'' اُس نے جلدی سے بیگ کھول کے کارڈ باہر نکالا۔ وہاں گھر کا پتہ موجود تھا۔

''یہاں سے پہلے رضا کے گھر چلیں گے'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا'' نوید نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''دوسرا مسئلہ پیر کو حل کروں گا'' علی نے کہا۔

''کونسا مسئلہ؟'' دونوں ہی نہیں سمجھے۔

''حسین کے قتل کا مسئلہ'' وہ اتنی آسانی سے نہیں چھوڑنے والا تھا۔ دونوں ہنس دیئے۔

''اچھا لیلیٰ کے مجنوں! ہم چلتے ہیں پھر'' نوید نے مقدم سے کہا تو اس نے کھینچ کے اُسکے بازو پر فائل ماری، لیکن وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

----------+----------+----------

اور بلآخر عمر نے اپنے بھائی کی بات مان لی۔ اُسے یقین ہی نہ آیا کہ سب کچھ اتنا آسان تھا؟ اُسے کوئی محنت ہی نہ کرنی پڑی تھی۔ اس نے اپنے والدین سے عمارہ کے بارے میں بات کی، وہ تو بچپن سے اُسے دیکھ رہے تھے، انکی خوشی کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ ساتھ میں خضر بھی بیٹھا تھا، اُس نے فوراً سے عمارہ کے رشتے والی بات بھی بتادی تاکہ گھر والے دیر نہ کردیں۔ اگلے ہی دن وہ لوگ طلبگار بن کر اُنکے گھر موجود تھے۔ عمارہ کے گھر والوں نے سوچنے کا رسمی سا وقت لیا اور چونکہ انکی اپنی بیٹی کی پسند بھی شامل تھی اس میں، تو پھر تو انکار کی کوئی گنجائش ہی باقی ہی نہ رہی۔ عمارہ کی پھوپھو سے سلیقے کے ساتھ معذرت کرکے عمر کے لیے ہاں کردی گئی۔ اُسکے بعد ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں دونوں کی بات پکی کرکے، شادی عمارہ کی پڑھائی ختم ہونے پر رکھی دی گئی۔ جب تک عمر اپنی تعلیم مکمل کرکے سیٹل ہونے کی کوشش کرسکتا تھا۔

آج وہ دونوں اپنے گھر سے اجازت لیکر آئسکریم کھانے آئے تھے۔ بچپن سے دوستی تو تھی، لیکن اب منگنی ہونے کے بعد ملاقات کی اجازت مشکل سے ہی ملتی تھی۔

''شکر ہے کہ کسی قسم کی کوئی مشکلات نہیں آئی ہمارے رشتے میں'' وہ دونوں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑے، اپنے اپنے کپس سے آئسکریم کھا رہے تھے۔

''ہاں واقعی، مجھے لگا تھا کہ پھوپھو شاید اس بات کا برا منالیں گی، لیکن عمر! انہوں نے تو بلکل برا نہیں مانا بلکہ بہت اچھے سے معاملے کو سنبھال لیا'' وہ بتا رہی تھی۔

''یہ اللہ کا کرم ہے'' اس نے دل سے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

''ویسے اچھی لگ رہی ہو بہت'' عمر نے اُسکی تعریف کی تو وہ مسکرائی۔

''تھنکس''

''اگر خضر احساس نہ دلاتا، تو میں تو اپنی ہی غلط فہمیوں میں اُلجھ کر، اپنا نقصان کر چکا ہوتا اور اگر خدانخواستہ تم مجھے۔۔۔''

''تم مجھے نہ ملتی، عمارہ تو میں پاگل ہوتا، جنگلوں میں نکل جاتا اور ہر طرف عمارہ عمارہ پکارتا۔۔۔ لوگ مجھے پتھر مارتے اور میں بس تمہیں یاد کرتا'' اس آواز پر دونوں ہی اچھل پڑے تھے۔ اور وہ ہنستا ہوا انکی طرف آرہا تھا۔

''تمہیں چاولوں میں کنکر بننا ضروری ہوتا ہے؟'' عمر نے خضر کے وہاں ٹپک پڑنے پر منہ بناتے ہوئے کہا۔ اپنی بات نامکمل رہ جانے کا دکھ ہوا تھا۔

''ایں؟ یہ کونسا محاورہ ہے؟'' عمارہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ جدید محاورہ ہے بھابھی جی!'' خضر نے عمر کے ہاتھ سے آئسکریم کا کپ تقریباً جھپٹتے ہوئے کہا۔

''تم میں کچھ شرم، کچھ حیا ہے؟ دو لوگ بات کر رہے ہوں تو اس طرح گھستے ہیں بیچ میں؟'' عمارہ نے اپنی جھینپن مٹانے کے لیے، اُسے غصّے سے کہا۔

''کونسے دو لوگ بھئی؟ آج تک ہم جہاں بھی گئے ہیں، تینوں ساتھ ہی گئے ہیں ناں؟ پھر آج کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر آگئے؟'' اس نے آئسکریم منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''پہلے کی بات اور تھی''عمر نے اُسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''تو پہلے کیا بات تھی؟اور اب کیا بات ہو گئی؟میں بھی سننا چاہتا ہوں''انجان بننے کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

''اِدھر دو یہ۔۔۔خود ہی اپنی ڈائیٹ خراب کرتے ہو،پھر سارا دن ایکسر سائز میں برباد کرتے ہو''عمر سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے خضر سے کپ واپس چھین لیا۔

''میں کہہ رہی ہوں عمر! سمجھا کر رکھو اپنے بھائی کو،ورنہ میری اور اسکی جنگ ہو جائے گی''عمارہ نے غصّے سے کہا۔

''خبردار!میرے اور میرے بھائی کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا،سوکن بن جاؤنگا میں تمہاری''خالص زنانہ عورتیں کی طرح لڑتے ہوئے کہا۔

''وہ تو تم ویسے ہی بنے رہتے ہو''عمر نے بیزاری سے کہا تو خضر تڑپ اٹھا۔

''بھائی بھائی نہ رہا''اُس نے مصنوعی دکھ سے کہا تو نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں ہنس پڑے۔

----------+----------+----------

کن من برستی بارش پچھلے تین روز سے جاری تھی،درخت،پرندے،اینٹوں سے بنی ڈیپارٹمنٹ کی خوبصورت عمارتیں،صاف ستھری سڑکیں،ہر شے بھیگی بھیگی سی تھی،سردی بھی بڑھ چکی تھی۔حسین ہڈی پہنے،ہڈ سر پر ڈالے،دونوں ہاتھوں کو جیبوں میں ڈالے،اُسکے پیچھے آیا۔

''پہلا دن کیسا گزرا؟''اُسکے قریب جا کر اتنی زور سے پوچھا کہ وہ اچھل ہی پڑی۔

''حد کرتے ہو''دل پر ہاتھ رکھ کر اُسے گھورا۔ڈرا دیا تھا اس نے تو۔۔۔

''کیسا گزرنا تھا بھلا؟تم سے کہا بھی تھا کہ ڈیپارٹمنٹ تک چھوڑ دو،لیکن تم نے بھی ساری زندگی کا بدلا آج نکلا ہے''ناراضگی سے کہتی وہ چل پڑی،حسین بھی اُسکے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''تو محترمہ حور عین کو ڈیپارٹمنٹ نہیں ملا یا وہ کسی کی ریگنگ کا شکار ہو گئیں؟'' منہ چڑاتی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے پوچھا۔ بارش اتنی تیز نہ تھی کہ وہ گیلے ہو جاتے، لیکن حور عین نے پھر بھی چھاتا سر پر تان رکھا تھا۔ صرف اپنے سر پر۔۔۔ حسین اس سے مستثنیٰ تھا۔

''کسی کی مجال؟ بس تھوڑا سا بھٹکنا پڑا لیکن پہنچ ہی گئیں میں، ڈیپارٹمنٹ۔'' دونوں ساتھ ساتھ چلتے کتنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی بھیگی بھیگی عمارتوں کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یونیورسٹی تو جیسے بارش میں نکھر گئی تھی، پھول پودے اپنے رنگوں سے ہر جانب بہار لے آئے تھے۔ ابر آلود موسم اور برستی بوندوں نے ماحول کو عجیب سی تازگی بخش دی تھی۔ سٹوڈنٹس ہر جانب بکھرے ہوئے تھے، کوئی بیگ رکھے بینچ پر بیٹھا تھا، کوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ کے باغ میں گھاس پر بیٹھا تھا، کسی نے سڑک پر ہی تفریح لگائی ہوئی تھی تو کسی کو کلاس میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

''حور! وہ دیکھو کیا ہے اُس طرف؟'' دور کہیں سے نظر آتی عمارت کی چھت پر اشارہ کرتے حسین نے پوچھا۔

''کیا؟'' اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھتی حور عین رکی اور آنکھیں چھوٹی کر کے اسی جانب دیکھا۔

''میرا خیال ہے سولر پینل ہے''

''تو یہ بتاؤ چھت پر کیوں رکھا ہے؟''

''چھت پر نہیں رکھیں گے تو کہاں رکھیں گے؟'' اُسکی عقل پر ماتم کرتی دوبارہ چلنے لگی۔

''رکھیں گے تو وہیں، لیکن تم خود سوچو چھت پر تو اسے دھوپ لگتی ہو گی، اسے دھوپ سے بچانے کے لیے کیا کریں گے؟'' سوال معقول تھا۔

''پینا فلیکس ڈال دیں گے'' لو بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل سوال تھا؟

''پینا فلیکس؟'' اُس نے اپنی ہڈ پیچھے گراتے ہوئے، رک کر سنجیدگی سے اُسے دیکھا۔

''چادر بھی ڈال سکتے ہیں'' متبادل بھی بتا دیا۔

''چادر؟'' آبرو اچکا کے پوچھا، اگلے ہی لمحے حور عین کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''سولر پینل کو دھوپ سے کیوں بچائیں گے؟'' وہ چیخ پڑی۔

''چچ چچ۔۔۔ کس نے داخلہ دیا تمہیں یہاں؟''اُسکا کام ہو گیا تھا،اس لیے بڑے سکون سے کہتا آگے بڑھ گیا۔

''ایسا نہیں ہے، میرے دماغ نے دھوپ کو بارش سے بدل دیا اور میں سمجھیں کہ تم بارش کہہ رہے ہو''چھاتا سنبھالتی اُسکے پیچھے آئی، بادل ہلکے پھلکے گرجے تھے۔

''آپکے پاس دماغ بھی ہے؟''حیرت سے پوچھا۔

''تم سے تو زیادہ ہی ہے''چڑ کے کہا، آخر اُسکا دماغ اُسے ہمیشہ بے عزت ہی کیوں کرواتا تھا؟

''چلو چھوڑو اس بات کو، ابھی ہم وی ایس جا رہے ہیں، ایمان کو ساتھ لیں گے، اور لنچ کریں گے''

''اور یہ لنچ کون کروا رہا ہے؟''مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، میں''فراخ دلی سے کہا۔

''تم کب سے اتنے اچھے ہو گئے؟''وہ ابھی بھی مشکوک تھی۔

''نہیں نہیں حور عین صاحبہ! میں اتنا اچھا نہیں ہوں، یہ دراصل سرمایہ کاری ہے''

''ہیں؟''اُسکے چھوٹے سے دماغ کو بھلا اُسکی کہانیاں کہاں سمجھ میں آنے والی تھیں۔

''میں تم لوگوں پر آج اپنا سرمایہ لگاؤں گا، تبھی تو مجھے سود سمیت واپس ملے گا''بات اب سمجھ آگئی تھی۔

''ہونہہ۔۔۔ کنجوس انسان''منہ بگاڑ کر کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔ بارش تیز ہو چکی تھی، حسین بھی بھاگتا ہوا وی ایس میں جا گھسا تھا۔

----------+----------+----------

وقت بڑی تیزی سے گزرا تھا، جامعہ میں اُنکا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ آج بھی فارغ وقت میں وہ لوگ آرٹس لابی میں بیٹھے تھے۔ جہاں انہی کی طرح اچھی خاصی فارغ عوام ٹولوں کی شکل میں فرش پر بیٹھی تھی۔ یہ دراصل آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے درمیان میں دائرے کی شکل میں بنا جامعہ کا مشہور آڈیٹوریم تھا، جسکے باہر دائرے کی ہی شکل میں ایک طرح کا سٹنگ ایریا بنا تھا، جو تمام آرٹس ڈیپارٹمنٹ کو یہاں

لا کے جوڑتا تھا۔اسے آرٹس لابی کہتے تھے، کیونکہ یہاں کے گول دیو قامت ستون اور دیوار آرٹس کے طلبہ وطالبات کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتے تھے۔کچھ جگہ بینچ تھیں، کچھ جگہ چبوترے اور باقی پورا فرش خالی تھا، جہاں طلبہ وطالبات ٹولوں کی شکل میں فارغ بیٹھے تھے۔دیواروں پر قومی ہیرو کی تصاویر ہاتھوں سے بنائی گئی تھیں۔باہر تین روز سے جاری سردیوں کی بارش اب بھی برس رہی تھی، ایسے میں پڑھنے کا دل تو کسی نہ ہوتا، لیکن اللہ پوچھے جامعہ والوں کو، آندھی آئے یا طوفان، قیامت آئے یا جنگ ہو جائے، اُنہوں نے جامعہ بند نہیں کرنی تھی۔

''یار! کچھ کرو، کوئی مشورہ ہی دو، میں کیا کروں؟''مقدم نے باقی چاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔حسین غائب تھا۔

''کیا مشورہ دیں؟ اور کیوں دیں؟ اور کوئی کام دھندہ نہیں ہے کیا ہمارے پاس؟ اپنا مسئلہ خود حل کرو''رضا نے ازلی بیزاری سے کہا۔وہ کلاس کا ٹاپر تھا، آدھی کلاس تو ایسے ہی اس سے متاثر رہتی تھی۔اور وہ تھا کہ آدم بیزار۔

''بہت بد تمیز آدمی ہو تم، تم بتاؤ علی میں کیا کروں؟''اس نے علی سے پوچھا۔

''دفعہ دور۔۔میرا دماغ خراب ہے جوان بیکار کاموں کے لیے مشورے دوں۔''اس نے بھی ہری جھنڈی دیکھادی جبکہ لفظ بیکار کام پر اُس نے تڑپ کر دیکھا۔

''یار! کوشش تو کی تھی لیکن تمہارا مسئلہ تو جوں کا توں ہی ہے''اُسے پریشانی سے لب کاٹتا دیکھ، عمر کو ترس آیا۔

''تمہارا کیا ہے۔۔۔خود تو منگنی کروا کر بیٹھ گئے ہو۔امّاں ابّا سب راضی تھے۔لیکن میں کیا کروں؟ میری تو امّاں ہی نہیں مانیں گی''اس نے دکھی شکل بناتے ہوئے کہا۔آج کل اُسکے یہی دکھڑے تھے۔کچھ ماہ پہلے عمر کی منگنی ہو گئی تھی، جس میں کوئی سماج کی دیواریں تھی نہ کوئی ولن سب خوشی خوشی راضی ہو گئے تھے۔

''تمہاری امّاں کو اُسکی ماں سے مسئلہ ہے، ضروری تو نہیں کہ اس سے بھی ہو، تم بات تو کر کے دیکھو، پہلے سے ہی رونے بیٹھ گئے ہو''علی نے خاصی سمجھداری سے سمجھایا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے بات کرنے کا امّاں نے سننے سے پہلے ہی انکار کر دینا ہے''اس نے منہ بُسورا۔ باہر بادل گرجے تھے، اُدھر بادل گرجے اور اِدھر آس پاس بیٹھے فارغ ٹولوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔

''تو پھر بیٹھے رہو منہ بنا کر''اس نے جھلا کر کہا اور واپس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ پھر جیسے اچانک ہی کچھ یاد آنے پر دوبارہ سیدھا ہوا۔

''ویسے مجھے پوچھنا تھا کہ ماسٹرز تم لوگ کن مضامین میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''اس نے وہ بات کہہ دی جو وہ پچھلے کئی دنوں سے پوچھ رہا تھا، لیکن وہ لوگ تھے کہ سنجیدہ ہی ہو کر نہیں دے رہے تھے۔

''صبر کر لو بھائی، جلدی کیا ہے؟ پہلے بی بی اے تو مکمل ہو''نوید نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

''دو سال گزر چکے ہیں، تم لوگ ایسے ہی آرام سے بیٹھے رہنا اور گریجویشن ختم بھی ہو جائے گی۔ ابھی سے فیصلہ کر کے رکھو آگے کیا کرنا ہے؟ میں پہلے ہی بتا دوں کہ مجھے ملٹی میڈیا آرٹس سے ماسٹرز کرنا ہے''

''تم فکر نہ کرو میں بھی تمہارے ساتھ ہی ملٹی میڈیا آرٹس میں ایڈمشن لونگا''عمر نے اُسے تسلّی دی، جسے سن کر وہ تو خوش ہوا تھا۔ لیکن باقی سب نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا کم اور گھورا زیادہ تھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ مجھے شروع سے آرٹس پسند ہے، چاہو تو مقّی سے پوچھ لو''اس نے گڑبڑاتے ہوئے مقدم عرف مقّی کی جانب اشارہ کیا۔

''جھوٹ بول رہا ہے۔ عمارہ کے بی ایف اے میں ایڈمشن لینے سے پہلے تک اسے آرٹس نامی شے کی الف بے بھی نہیں معلوم تھی''اس سفید جھوٹ پر تو عمر ہکا بکا رہ گیا۔ باقی سب نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی رتی بھر کوشش نہیں کی تھی، یہ سچ تھا کہ عمارہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ سے بی ایف اے کر رہی تھی، لیکن عمر کا آرٹس میں جانے کا ارادہ شروع سے ہی تھا، وہ تو بس کچھ وجوہات کی بنا پر یہاں آ گیا تھا۔ اب دوست کی اس غدّاری پر خون کے گھونٹ بھرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''اچھا چھوڑ ان لوگوں کو، تمہارا ارادہ ہے نا میرے ساتھ ماسٹرز کرنے کا؟''علی نے اُنہیں ایک بار پھر موضوع سے ہٹتا دیکھ، گھسیٹ کر دوبارہ موضوع پر لانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں ہاں! پکا ارادہ ہے''اس نے اُسے تسلی دی تھی۔

''بھئی! میرا تو انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔ آگے سی ایس ایس میں آسانی رہے گی''نوید نے بتایا، سی ایس ایس اُسکا جنون تھا۔

''اور میرا ایم بی اے''رضا نے بھی اپنا منصوبہ بتایا تھا۔

''او!۔۔۔لیلیٰ کے مجنوں! تم نے کیا کرنا ہے آگے؟''نوید نے مقدم سے پوچھا، لیکن اس سے پہلے ہی عمر نے برجستہ جواب دیا۔

''شادی''سب کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔اُسی لمحے حسین وہاں آیا تھا ساتھ میں دو لڑکیاں بھی چلی آرہی تھی، وہ اُن کے پاس آکر رکا۔

''کیا حال ہیں بھائیوں؟''ہاتھ اٹھا کر سب کو مشترکہ سلام کیا۔

''ان سے ملو یہ دونوں میری کزن ہیں مگر ایک دوسرے کی کزن نہیں ہیں''اس نے اشارے سے دونوں لڑکیوں کے متعلق بتایا۔

''یہ ایمان ہے، میرے ماموں کی بیٹی۔۔۔اس نے ابھی ویژول اسٹڈیز میں داخلہ لیا ہے۔''اس نے اشارے سے سوبر سی لڑکی کا تعارف کروایا تو وہ مسکرائی۔اُسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ حسین کی ہی کزن ہے۔پھر اس نے دوسری کی طرف اشارہ کیا اور اس سے پہلے وہ کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑی۔

''میں اپنا تعارف خود کروا سکتی ہوں ہٹو یہاں سے''اپنا چھاتا لپیٹ کر، حسین کو دھکا دیتے، آگے سے ہٹاتی گویا ہوئی۔

''میں حور عین ہوں، اسکے چچا کی بیٹی، ویسے اس سے چھوٹی ہوں لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عقل اور سمجھ بوجھ کے معاملے میں اس سے کافی آگے ہوں''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں! پتہ ہے کتنی عقلمند ہو۔''حسین نے منہ بناتے ہوئے کہا اور پھر اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اتنی عقلمند ہے یہ کہ ابھی میں نے اس سے پوچھا کہ جب ہم سولر پینل کو چھت پر رکھتے ہیں تو اُسے دھوپ سے بچانے کے لیے کیا کرتے ہیں؟ تو پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا؟ کہتی ہے سولر پینل پر پینا فلکس ڈال دیں گے''حسین نے مزے سے بتایا تو وہاں قہقہہ پڑا، مگر وہ اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

''اپنے بارے میں بھی بتاؤ کہ تم نے پرسوں کیا کیا تھا؟''

''ہاں بتاؤ بتاؤ، کیا کیا تھا؟''سب نے دلچسپی سے پوچھا جبکہ وہ حور عین کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔

''پرسوں صبح یہ ویسلین اپنے بالوں پر لگا رہا تھا میں نے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگا نظر نہیں آتا کیا؟ بالوں پر جیل لگا رہا ہوں''،ہنسی کا فوارہ پھوٹا تھا وہاں۔۔۔ حسین برے برے منہ بنا رہا تھا جبکہ وہ خود بھی ہنستی جا رہی تھی۔ ہنستے ہوئے اُسکے دونوں گالوں پر گڑھے پڑتے تھے۔ وہ واقعی حسین کی ہی کزن تھی۔

''تمہاری کلاس کا ٹائم نہیں ہوا؟ چلو، چلتی پھرتی نظر آؤ مجھے''حسین نے اُسکی بکواس سے تنگ آکر اُسے وہاں سے چلتا کرنا چاہا۔

''کلاس سے یاد آیا، میں نے اپنا ڈیپارٹمنٹ تو بتایا ہی نہیں، میں ماس کمیونیکیشن کی سٹوڈنٹ ہوں''وہ اتنی آسانی سے ٹلنے نہیں والی تھی۔ اُسکے بعد وہ اور حسین جتنی دیر وہاں رہے بس ایک دوسرے کی ٹانگیں ہی کھینچتے رہے، اور باقی سب لطف اندوز ہوتے رہے۔ جبکہ ایمان ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انکی بچکانہ حرکتیں دیکھ رہی تھی۔

وہ زندگی کے عجیب دن تھے۔۔۔۔

فضول باتوں پر ہنسی رکتی نہ تھی۔۔

بچکانہ حرکتیں بھی لطف دیا کرتی تھیں۔۔۔

زندگی کا مقصد ضرور تھا، مگر فکریں آزاد تھیں۔۔۔

پریشانیوں میں بھی تفریحات تھیں۔۔۔

وہ زندگی تھی۔۔۔اور بس وہی زندگی تھی۔۔۔۔

لیکن شاید ہمیشہ کے لیے نہ تھی۔۔۔

----------+----------+----------

گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، سامنے ہی لاؤنج میں، صوفے پر اُسکے ابّا کے ساتھ وہ بیٹھی تھی۔ وہ یعنی لیلیٰ۔۔۔

مقدّم خوشگوار حیرت کے ساتھ اندر داخل ہوا اور سب کو سلام کیا۔

''تم کب آئی؟'' وہ سوات میں رہتی تھی۔ لہٰذا یہاں اپنے گھر میں، اُسے دیکھنا مقدم لیے واقعی باعث حیرت تھا۔

''میں صبح ہی آئی ہوں۔ ماموں نے پک کیا ہے مجھے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بہت پیاری اور معصوم تھی وہ۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا ابّا؟'' اس نے اپنے باپ سے شکوہ کیا، لیکن انکے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی اُسکی ماں وہاں داخل ہوئیں، وہ غالباً اُسکی گفتگو سن چکی تھیں۔

'کیوں بیٹا؟ اس گھر میں کوئی کام کرنے سے پہلے تمہیں بتایا جاتا ہے کیا؟ یا تم سے اجازت لی جاتی ہے؟''

''نہیں امّاں میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا'' وہ گڑبڑایا۔

''بھئی یہ سرپرائز تھا'' ابّا نے جواب دیا۔

''ہاں واقعی سرپرائز تھا۔۔ بہت بڑا'' امّاں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کتنے دنوں کے لیے آئی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''دنوں کے لیے نہیں بیٹا! سالوں کے لیے بھیجا ہے تمہاری پھوپھو نے'' لیلیٰ سے پہلے مقدّم کی ماں نے جواب دیا تھا۔

''مطلب؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''بھئی، لیلیٰ نے یہاں داخلہ لیا ہے یونیورسٹی میں، وہاں سوات میں تو کوئی قابل ذکر یونیورسٹی ہے نہیں'' ابّا نے جلدی سے کہا کہ آیا امّاں پھر سے کوئی طنز کا تیر نہ چلادیں، مقدم خوش ہوا۔

''داخلہ لیا نہیں ہے بلکہ کروایا ہے تمہارے ابّا نے'' وہ کہاں باز آنے والی تھیں؟

''بھلا بتاؤ پورے خاندان میں کوئی لڑکی، میٹرک سے آگے پڑھی نہیں ہے، اور تمہارے ابّا کو پتہ نہیں کیا شوق چڑھا ہے؟ بھتیجی کو شہر کی جامعہ سے ڈگری دلوائیں گے'' وہ پیالیوں میں چائے نکالتے ہوئے عام سے انداز میں بولیں۔ لیلیٰ سر جھکائے صوفے کے ہتھے پر ناخن رگڑ رہی تھی۔ وہ لڑنے جھگڑنے والی لڑکی نہیں تھی، زیادہ تر خاموش رہتی تھی۔ مقدم اور اُسکے ابّا کو برا تو لگا لیکن کیا کر سکتے تھے؟

''اب تو آگئی نہ، اب یہ یہیں رہے گی۔ جاؤ مقدم، لیلیٰ کا سامان پہنچادو کمرے میں'' ابّا نے ماحول کا اثر زائل کرنے کی غرض سے کہا۔

''ارے! میرا بچہ ابھی باہر سے آیا ہے، وہ کیوں سامان پہنچائے گا اسکا؟ ملازم مر گئے ہیں کیا؟'' انہوں نے سختی سے کہا لیکن مقدم ان سنی کرتے ہوئے اُسکا سامان اٹھا چکا تھا۔ لیلیٰ بھی سر جھکائے اُسکے پیچھے چلی گئی۔ صد شکر اس بار انہوں نے کچھ کہا نہیں، بس سر جھکائے بڑبڑ کرتی رہیں۔ جبکہ لیلیٰ کو اُسکا کمرہ دکھاتے ہوئے مقدم کو اپنا مستقبل ہر طرف سے تاریک ہی نظر آرہا تھا۔

----------+----------+----------

اتوار صبح دس بج کر پانچ منٹ، مورخہ چھ جنوری:

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

کمرے میں صرف دو آوازیں تھیں، ایک گھڑی کی سوئیوں کی اور دوسری اُنکی سانسوں کی۔

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

گھڑی کی سوئیاں سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ علی کی نظریں گھڑی تک گئی۔ اُسے یہاں آئے ہوئے بس پانچ منٹ ہی گزرے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے یہاں ہو۔

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

عمر کی نظریں بھٹک بھٹک کر مقدم تک جاتیں اور واپس آجاتیں۔ اس نے سلام دعا کے بعد دوبارہ نظر اٹھا کر بھی اُنہیں نہیں دیکھا تھا۔ چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ عمر کو اس پر کسی اجنبی کا گمان ہوتا تھا۔

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

گھڑی کی آواز سارے میں گونج رہی تھی کہ اچانک ہی فضاء میں دو نفوس کے بولنے کی آوازوں نے گھڑی کی سوئیوں کو مات دی۔ آوازیں کہیں قریب سے آرہی تھیں اور آہستہ آہستہ مزید قریب تر ہوتی جارہی تھیں، جیسے کوئی گول کمرے کی جانب ہی آرہا ہو۔

''میں نے کوشش کی تھی وقت پر پہنچنے کی لیکن تھوڑا لیٹ ہو گیا۔''اس آواز پر لمحے بھر کے لیے اندر بیٹھے تینوں نفوس چونکے تھے۔ دماغ کا کوئی گوشہ اس آواز کے شناسا ہونے کا سگنل دے رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، ڈی آئی جی صاحب کو آنے میں ابھی پندرہ منٹ ہیں''کسی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھولنے والا وہی ریسیپشنسٹ تھا، جو اُن کو بھی اس کمرے تک لایا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اُسے اندر آنے کا راستہ دکھایا۔ آنے والے کو دیکھ کر وہاں سنسنی پھیل گئی تھی۔

نہیں۔۔۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟

وہ کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔

یا انکے ساتھ کوئی کھیل کھیلا جارہا تھا؟

کیا یہ کوئی مذاق تھا؟

یا کوئی بیہودہ پرانک؟

خود اس نے ایک نظر پورے کمرے پر ڈالی اور بلکل خاموشی سے چلتا ہوا صوفے کے سب سے الگ تھلگ حصے پر جا بیٹھا۔ اُنہیں دیکھ کر اگر اُسکے چہرے پر شناسائی کی یا حیرت کی کوئی جھلک آئی بھی تھی، تو وہ اُس نے پلک جھپکتے میں غائب کر دی۔ صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے موبائل نکال لیا، اب وہ سکرین اسکرول کر رہا تھا۔

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

گھڑی کی سوئیوں کی آواز پھر سے سنائی دینے لگی تھی۔

''رضاالٰہی۔۔۔'' مقدم کے دل کے کسی کونے میں اُسکا نام گونجا تھا۔ رضا کی یہاں آمد نے اُن سب کو جس حیرت کے جھٹکے سے دوچار کیا تھا وہ اس سے نکل نہیں پا رہے تھے۔

کیوں تھا وہ یہاں؟ سوال تو یہ تھا کہ وہ سب یہاں کیوں تھے؟ دس سال بعد اس طرح اُنہیں یہاں کیوں بلایا گیا تھا؟

کیا تھا یہ سب؟

کوئی گیم؟

کوئی اتفاق؟ اتفاق ایسا نہیں ہوتا۔

اب تک وہ تینوں اپنی موجودگی کا کوئی جواز نہیں ڈھونڈ پائے تھے کہ اب رضا بھی یہیں تھا۔ اجنبی چہرے کے ساتھ۔۔۔۔

مقدم کچھ حیرت سے تینوں کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ عمر کسی سوچ میں محو تھا، وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ علی کے چہرے پر عجیب سی سختی در آئی تھی جو رضا کے یہاں آنے سے قبل نہ تھی۔ جب کہ خود رضا، بے تاثر چہرے کے ساتھ موبائل لیے بیٹھا تھا۔ جیسے اُسے اُن سب سے کوئی سروکار نہ ہو۔ جیسے وہ سارے اُسکے لیے اجنبی ہو، جیسے اُن سب سے اُسکا کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ فضاء میں عجیب سا تناؤ پھیل گیا تھا۔ رضا نے تو رسمی طور پر بھی سلام کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ علی نے بھی اُسکی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور عمر۔۔۔ وہ ایک نظر میں ہی جان گیا تھا کہ یہ وہ رضا نہیں ہے جسے وہ دس سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ وہ ٹوٹا پھوٹا زندگی سے ستایا ہوا لڑکا نہیں ہے۔ یہ تو کوئی سخت مزاج قسم کا جوان مرد تھا۔ جسکی ایک ایک شے سے امارت ٹپکتی تھی۔ جسے اپنے علاوہ کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ کیا وہ خود غرض ہو گیا تھا؟ کون تھا یہ؟ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے۔ لیکن شاید وہ جلد جان جائیں کہ۔۔

وہ شہر کی سب سے بڑی جامعہ کا بہترین فیکلٹی ممبر، سٹوڈنٹس کا پسندیدہ لیکچرر اور مشہور و معروف **"برجا اسکولنگ سسٹم"** کا مالک تھا۔ اُسکے اسکول کی بیک وقت چالیس شاخیں، شہر میں بہترین طریقے سے چل رہی تھی۔ اور وہ اُس سیاہ و سپید کا اکیلا مالک تھا۔ یہ سب اس نے خود کمایا تھا، اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر، وہ پارس تھا، جس کام کو ہاتھ لگاتا، اُسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا۔ قسمت اس پر مہربان تھی اور وہ تھا کہ قسمت سے شاکی۔۔۔۔

ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔ٹک۔۔۔

گھڑی کی سوئیاں آگے بھاگ رہی تھی لیکن وہ پیچھے جا رہے تھے۔ پیچھے کہیں دُور کھڑا ماضی انکا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئیں اور ماضی اُنہیں کچھ لمحے کے لیے خود میں گم کر لے۔

----------+----------+----------

تیرہ سال پہلے:

''یہ مستقیم کہاں غائب ہے؟''اُستانی سلیمہ نے کلاس پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں میم! پچھلے ایک ہفتے سے کسی نے بھی اُسے نہیں دیکھا''اُسکی پکی سہیلی نے اُنہیں جواب دیا تھا۔

''لیکن کچھ تو پتہ چلے کہ ایسے اچانک کہاں گیا؟ وہ کبھی بھی چھٹی نہیں کرتا، اپنے گاؤں بھی جاتا ہے تو درخواست دے کر جاتا ہے''اُنہوں نے پریشانی سے کہا۔

''آپکو نہیں پتہ میم؟''حسین کی حیران کن آواز پر سب کی گردنیں پیچھے مڑی تھیں اُسے دیکھنے کے لیے۔

''کیا نہیں پتہ؟''اُنہوں نے اس سے بھی زیادہ حیرانی سے پوچھا۔

''مستقیم کا پچھلے ہفتے انتقال ہو چکا ہے''اس نے جتنے افسوس سے کہا تھا، پوری کلاس کے ساتھ ساتھ اُسکے دوستوں کو بھی جھٹکا لگا تھا۔ مستقیم انکا کلاس فیلو تھا۔

''یہ کب ہوا؟''

''کیسے ہوا؟''

''ہمیں تو پتہ نہیں چلا''

''ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ملا تھا''

کلاس سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''میم! پچھلے ہفتے، شاید منگل کی رات تھی۔ میں کسی کام سے ہسپتال گیا تھا تو میں نے وہاں ایمرجنسی میں مستقیم کو لہولہان دیکھا۔ میں اسکے پاس گیا تو وہ۔۔۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ کلاس میں سب کی آنکھیں نم ہونے لگی، دل دہشت زدہ ہونے لگے۔

''تو وہ مر چکا تھا، پھر میں نے اُسکے گھر والوں کو فون کیا، اُسکے سامان میں سے نمبر لے کر۔۔۔ رات تک اُسکے گھر والے اندرون سندھ سے کراچی پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے کسی کو اطلاع بھی دینے نہیں دی اور جلدی سے جنازہ اپنے ساتھ لے کر گاؤں چلے گئے، اُسکے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم'' مرحوم کے کچھ دوست ضبط کی شدت سے لال آنکھیں لیے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور مستقیم کی پکی والی سہیلی نے تو رونا ہی شروع کر دیا تھا۔ اُستانی کو بھی افسوس ہوا وہ ایک اچھا طالبعلم تھا۔

''لیکن یہ بات تم نے پچھلے ہفتے کیوں نہ بتائی؟'' اُنہوں نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''کیونکہ پچھلے ہفتے بارشوں کی وجہ سے میں یونیورسٹی نہیں آسکا تھا'' اس نے سکون سے جواب دیا۔

''اوہو۔۔۔ اللہ اُسے جنت نصیب کرے'' انہوں نے تعزیتی انداز میں کہا اور حاضری لینے کے بعد کلاس سے روانہ ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ بھی کہتا کلاس کے سی آر نے اٹھ کر کلاس میں اعلان کیا۔

''کل، یعنی بروز منگل، ہم اپنے مرحوم دوست مستقیم کی بخشش کے لیے ڈیپارٹمنٹ میں ختم قل کرینگے، آپ سب سے شرکت کی درخواست ہے'' اِس اعلان پر سب نے ہی اتفاق کیا تھا۔

----------+----------+----------

رضا نے بظاہر تو اُن پانچوں سے دوستی کر لی تھی، لیکن اس نے کسی کو بھی ایک حد سے زیادہ خود کے بارے میں جاننے نہ دیا تھا۔ اُن لوگوں نے بارہا کوشش کی تھی کہ اُس سے، اُسکے گھر والوں کے متعلق پوچھیں، لیکن ہر بار وہ خوش اسلوبی سے بات ٹال جاتا۔ حتٰی کہ تین سال گزر گئے لیکن رضا نے اپنے گرد چڑھے خول سے باہر آنے کی کوشش نہ کی تھی۔

اس دن وہ جامعہ سے واپس گھر آیا اور نہانے چلا گیا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو گھر کا گارڈ سامنے کھڑا تھا۔

''رضا بھائی! یہ دونوں آپ کا پوچھ رہے تھے''اس نے اپنے پیچھے کھڑے دو لڑکوں کے جانب اشارہ کیا، جسے دیکھ کر رضا حیران رہ گیا تھا۔

----------+----------+----------

''مجھے ذرا یہ حسین مل جانے دو، ایسا حال کرونگا کہ اُسکی اگلی سات نسلیں یاد رکھیں گی'' بائیک پر اپنے پیچھے بیٹھے علی کی آواز اُسے سخت تپی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''حسین کا جو حال کرنا ہے کرو لیکن اُسکی سات نسلوں کا کیا قصور؟''نوید نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ بائیک چلانے کے باعث اُسکی آواز علی تک نہیں پہنچ رہی تھی، لہٰذا اُسے زور سے بولنا پڑ رہا تھا۔

''چپ کرو تم، مجھے شدید غصّہ آرہا ہے۔ سارا دن برباد ہو رہا ہے اُسکی وجہ سے''اُسکا غُصہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''ہاں! تو ساتھ میں میرا بھی تو ہو رہا ہے''نوید نے احساس دلایا کہ دیکھو میں بھی تو وقت ضائع کر رہا ہوں، اور تمہارا غصّہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔

''میں نے کہا ہے ساتھ آنے کو؟''علی کا غصّہ آس پاس ہر شے پر اترتا تھا۔

''اچھا ہوا میں ساتھ آگیا۔ جتنے تم غصّے میں ہو نا، یہ بائیک کہیں مار ہی دینی تھی تم نے''

''اور کتنا اچھا ہوتا جو بائیک کے سامنے حسین ہوتا''اس نے دانت پیستے ہوئے کہا، غصّے کا گراف مزید بڑھا۔ یونیورسٹی میں حسین نے اُسکے اور رضا کے بیگ کا سامان تبدیل کر دیا تھا، جسکے باعث علی کا ادھورا اسائمنٹ بھی رضا کے پاس چلا گیا تھا۔ اب وہ سارا سامان لینے اُسکے گھر جا رہا تھا۔ اُسے یہ خواری صحیح معنوں میں کھل رہی تھی۔

''شاید یہی گھر ہے۔''نوید نے بائیک روکتے ہوئے گھر کی جانب دیکھا۔

''ایڈریس تو یہی ہے'' علی بائیک سے اترا۔ نوید نے بائیک کنارے سے لگا کر کھڑی کی اور دروازے تک آیا، وہ ایک عالیشان بنگلہ تھا۔ جسکے درودیوار کو سفید اور گرے رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ دروازے پر بیٹھا چوکیدار اُنہیں دیکھ اٹھ کھڑا ہوا۔

''جی؟ کس سے ملنا ہے؟''

''''رضاالٰہی، اسی گھر میں رہتا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''جی! یہیں رہتے ہیں۔ آپ؟''

''ہم اُسکے دوست ہیں۔ اُسے بلادیں ذرا'' چوکیدار نے دروازہ کھول کے اندر دیکھا پھر کسی کو اشارے سے پاس بلایا۔

''رضا بھائی اپنے گھر پر ہیں؟'' اس نے دروازے پر آنے والے دوسرے چوکیدار سے پوچھا۔

''جی! گھر پر ہی ہیں''

''اچھا ان دونوں کو رضا بھائی کے گھر لے جاؤ، یہ انکے دوست ہیں'' اس نے کہا اور پھر دروازے سے ہٹتے ہوئے، اُن دونوں کو اندر جانے کا راستہ دیا، وہ اندر داخل ہوئے اور دوسرے چوکیدار کے پیچھے چلنے لگے۔ بنگلہ نہ صرف خوبصورت تھا بلکہ اُسکی سجاوٹ بھی سحر انگیز تھی۔ لیکن اُنہیں حیرت کا جھٹکا تب لگا، جب چوکیدار اُنہیں لان سے گھماتا ہوا گھر کے پیچھے بنے چھوٹے سے کوارٹر کے پاس لے کر پہنچا اور اُسکا دروازہ بجانے لگا۔ نوید اور علی نے شدید حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ جتنا خوبصورت یہ بنگلہ تھا اتنا ہی بدصورت یہ کوارٹر تھا۔ دروازہ زنگ آلود اور دیواروں پر جگہ جگہ سیلن کے نشانات نظر آتے تھے۔ سیلن زدہ مقامات پر سے دیواروں کا رنگ بھی اُڑ چکا تھا۔ دو مرتبہ دستک دینے کے بعد دروازہ کھلا اور اندر سے رضا کا چہرہ دکھائی دیا۔

''رضا بھائی! یہ دونوں آپکا پوچھ رہے تھے'' چوکیدار نے اُن دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اُنہیں وہاں دیکھ کر حیرت کا جو تاثر رضا کے چہرے پر آیا تھا، وہ اُن سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔ گیلے بال اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ ابھی ہی نہا کر آیا ہے۔

''تم دونوں؟ یہاں؟'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ چوکیدار اُن دونوں کو رضا کا شناسا جان کر مطمئن ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اُنہیں اب سمجھ آیا کہ گارڈ نے رضا کا گھر کیوں کہا تھا؟

''ہاں وہ، تمہارا سامان میرے پاس ہے، وہی دینے آیا تھا؟''

''مطلب؟'' رضا سمجھا نہیں، جواباً علی نے ساری بات اُسے بتادی۔

''اوہ۔۔۔ میں نے بیگ کھول کر دیکھا ہی نہیں، اس لیے مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ خیر، تم دونوں اندر آؤ۔ میں سامان نکالتا ہوں بیگ سے'' وہ نظریں جھکا کر کہتا ہوا دروازے سے ہٹا۔ وہ دونوں اُسکے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

اندر آنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوارٹر باہر سے جتنا بدصورت تھا، اندر سے اتنا ہی تباہ حال۔ چار دیواری میں مقید ایک پرانا سا پلنگ، جس پر رضا کا یونیورسٹی بیگ کھلا ہوا پڑا تھا۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار میں ایک دروازہ تھا، جو یقیناً باتھ رُوم کا تھا۔ دروازہ جگہ جگہ سے گل چکا تھا، لگتا تھا کسی بھی وقت اپنی عمر پوری کر کے گر پڑے گا۔ پلنگ کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا فریج تھا اور فریج کے برابر میں گیس سلنڈر، جسکے اوپر ہی چولہا بنا ہوا تھا۔ پلنگ کے دوسری طرف والی دیوار پر ایک سنگل ڈور کی خستہ حال الماری تھی۔ چھت پر لگا پنکھا بھی برائے نام ہی ہوا دے رہا تھا۔ اسکے علاوہ پورے کوارٹر میں کوئی دوسری قابل ذکر چیز نہ تھی۔ حتٰی کہ بیٹھنے کے لئے کرسی تک نہ تھی۔ اُسی پلنگ پر علی نے اپنا بیگ رکھا اور رضا کا سامان نکالنے لگا۔

''حسین کی وجہ سے تم لوگوں کو یہاں آنا پڑا۔ میں یونیورسٹی میں ہی دیکھ لیتا تو اتنی خواری نہ کرنی پڑتی'' رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ماحول کا بوجھل پن ختم کرنا چاہتا تھا شاید، یا اپنی خفت مٹانا۔

''حسین کو اسکا اچھا بدلا دینے کا ارادہ ہے میرا'' علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دونوں اپنا اپنا سامان لے چکے تھے۔

''سوری، اِس وقت تم لوگوں کو چائے پانی نہیں پوچھ سکتا'' وہ تھوڑا شرمندہ سا نظر آتا تھا۔

''ارے! کوئی بات نہیں یار! ہمیں ویسے ہی جلدی ہے، چائے پھر کبھی صحیح'' علی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے، خوشدلی سے کہا۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اِس جگہ اُسکا خود کا دم گھٹ رہا تھا۔

''تم اس سلینڈر کو کمرے میں کیوں رکھتے ہو؟ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے'' نوید نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ بیٹھا۔

''یار! کھانا وغیرہ بنانا ہوتا ہے اس لیے، لیکن میں احتیاط سے استعمال کرتا ہوں'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔ لیکن دھیان رکھنا''

''ہم چلتے ہیں۔ اللہ حافظ'' علی نے کہا اور دونوں اس سے مصافحہ کرنے کے بعد باہر آ گئے۔ باہر آ کر دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ اس مرتبہ علی نے اپنی بائیک خود چلائی اور نوید کو اُسکے گھر کے باہر اُتارا تھا۔ راستے بھر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی، دونوں ہی گم صم سے تھے۔

''مجھے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا، کہ رضا اتنے برے حال میں رہتا ہو گا'' بائیک سے اترنے کے بعد نوید نے کہا۔ علی دونوں بازو بائیک کے ہینڈل پر ٹکائے، اُسے ہی سن رہا تھا۔

''یعنی۔۔۔ وہ کوارٹر تو کیبن کہلانے کے لائق بھی نہیں تھا۔ اس سے اچھے تو ہماری یونیورسٹی کے ہوسٹل کے کمرے ہوتے ہیں۔'' نوید کو ابھی تک افسوس ہو رہا تھا۔

''رضا نے کبھی اپنے گھر کے حالات کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے کہا تھا کہ اُسکی ساری فیملی کینیڈا میں رہتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس بات میں کتنی سچائی ہے؟ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جو بات اس نے ہمیں خود نہیں کہی ہے، اس بات کو ہمیں بھی کسی کے سامنے نہیں کہنا۔ ہمیں بھی اُسکا پردہ اور بھرم رکھنا چاہیے'' علی نے سنجیدگی سے کہا۔

''ظاہر ہے یار! ایسا ہی ہو گا۔ اور ایک بات بتاؤں؟ رضا جھوٹ نہیں بولتا۔ یقیناً اُسکی فیملی اُسے سپورٹ نہیں کرتی'' نوید نے جواب دیا۔

''اتنا اچھا لڑکا ہے یار! کوئی ماں باپ کیسے اتنے اچھے بیٹے کو disowned کر سکتے ہیں؟'' علی نے دکھ سے کہا۔

''اچھے برے سے فرق نہیں پڑتا علی!۔۔ سوال یہ ہے کہ کوئی ماں باپ ایسا کر کیسے سکتے ہیں اپنی اولاد کے ساتھ؟'' نوید نے کہا اور اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا انکے پاس۔ رضا کی زندگی کئی گرہوں میں بندھی تھی۔ وہ جتنا کھولنے کی کوشش کرتے اتنا زیادہ ہی اُلجھتے جاتے تھے۔

----------+----------+----------

اگلے دن ڈیپارٹمنٹ میں مرحوم مستقیم کے ایصال ثواب کے لیے ختم قل رکھا گیا تھا، جس میں سب شریک ہوئے تھے، سوائے حسین کے، اُسکا فلحال کچھ اتا پتہ نہ تھا۔ کلاس کے طالب علموں نے جوش و خروش کے ساتھ اس میں شرکت کی تھی۔ ایک آدھ سینئرز بھی اپنی

کلاس کے وقفے کے دوران آکر تعزیت کر گئے تھے۔دعا ختم ہونے کے بعد اُسکا دوست روسٹرام پر آیا، جہاں پیچھے مستقیم کی انلارج تصویر لگی ہوئی تھی۔

''میں مستقیم کا بہت اچھا دوست رہ چکا ہوں اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک بہت ہی اچھا انسان تھا''اس کے دوست نے کہنا شروع کیا۔

''مجھے یہ کہہ لینے دیں کہ بے حد مختصر وقت میں وہ ہمارا بہت اچھا دوست بن گیا تھا''اس نے بھرائی ہو آواز میں کہا۔

''وہ ایک بہت۔۔۔بہت''آنسوؤں کا گولا گلے میں اٹکنے لگا، وہ بات مکمل نہیں کر پایا، حاضرین محفل میں سے بھی بہت سے لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔مقرر نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی۔

''میں کہنا چاہتا تھا کہ مستقیم۔۔۔مستقیم۔۔۔''وہ کہتے کہتے رُکا۔حاضرین ہمہ تن گوش،اور وہ کہ اُسکی آنکھیں باہر آنے کو بیتاب۔۔۔

''مستق۔۔۔مستقیم۔۔۔''اُسکی زبان پر ایک ہی نام اٹک کر رہ گیا تھا۔اب کہ حاضرین بھی بیزار ہونے لگے تھے۔

''مو۔۔۔مس۔۔۔''اُسکی آواز کانپ رہی تھی اور وہ مسلسل دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''اس آواز پر تمام طلبہ وطالبات کی نظریں پیچھے کی جانب گئی تھیں۔اور جو جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔

''یہ تو۔۔۔یہ تو۔۔۔''مقدم کی زبان لڑکھڑائی۔

''یہ تو مستقیم ہے؟''سب سے پہلے رضا کا سکتا ٹوٹا۔

''ہاں! میں مستقیم ہی ہوں،اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟''وہ بیچارہ سمجھ نہیں پایا کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

''تم تو مر گئے تھے''پتہ نہیں سوال تھا یا اطلاع؟

''میں کیوں مرنے لگا؟''لیکن اُسکے کچھ کہنے سے قبل ہی پورے آڈیٹوریم کا سکتا ایک ساتھ ٹوٹا تھا اور پھر جسکو جس دروازے سے جگہ ملی، وہ وہیں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ہر طرف چیخ وپکار مچ گئی۔مستقیم بیچارہ جسکو بھی روکتا وہ اُسی سے جان بچا کر چیختا چلاتا بھاگ نکلتا۔

''رکو اِدھر''اس نے پاس سے بھاگتے ایک دُبلے پتلے سے لڑکے کا بازو پکڑ کر اُسے روکا۔

''چھوڑو مجھے بھوت۔۔۔امی۔۔۔امی بھوت۔۔۔''وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش میں ناکام ہونے لگا۔

''میں بھوت نہیں ہوں، مستقیم ہوں''اس نے لڑکے کے سر پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''تم مستقیم کے بھوت ہی ہو کیونکہ تم مر گئے ہو''اس نے اُسے باور کروایا۔

''ہیں؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میں کیوں مرونگا؟ میں زندہ ہوں، تمہاری آنکھوں کے سامنے''

''جھوٹ مت بولو تم مر چکے ہو''لڑکا بضد تھا۔

''ایک لگاؤں گا گھما کر۔۔۔کس نے کہا ہے یہ؟''اُسکا ضبط جواب دے گیا۔

''حسین نے کہا تھا، اس نے خود تمہاری لاش دیکھی تھی''لڑکے نے کہا تو اس نے بے یقینی سے اُسکا بازو چھوڑا۔

''حسین نے؟''

''ہاں! حسین نے۔۔۔''لڑکا کہتے ہوئے وہاں سے سرپٹ بھاگا تھا۔

''حسین۔۔۔۔۔۔''اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔بے یقینی کی جگہ اب غصّے نے لے لی تھی۔بس نہیں چل رہا تھا کہ حسین کو کچّا چبا جائے۔

----------+----------+----------

''اپنی خیر مناؤ اب، مستقیم پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈھتا پھر رہا ہے تمہیں''وہ پانچوں اُسکے سر پر کھڑے تھے۔مستقیم نے بڑی مشکل سے سب کو یقین دلایا تھا کہ اُسے ایمرجنسی میں ہوسٹل چھوڑ کر گاؤں جانا پڑا تھا اور اُسکے پاس کوئی فون وغیرہ بھی نہ تھا، حسین سامنے نظر آیا تو وہ اُسے ہی بتا کر چلا گیا کہ اُسے فوراً گاؤں پہنچنا ہے اور حسین کلاس کے سی آر کو اطلاع دے دے۔اور اس بدتمیز نے اطلاع بھی دی تو کیا؟ ساری بات جاننے کے بعد جہاں کچھ لوگوں کو غصّہ آیا تھا، وہیں کچھ لوگوں کے لیے ہنسی روکنا محال ہو گیا تھا۔

''یار! بچالو مجھے اس بدروح سے۔۔پلیز''حسین نے مصنوعی خوف سے کہا۔

''سدھر جاؤ تم''نوید نے اُسکے کان کھینچے تھے۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟معلوم بھی ہے کہ سب لوگ کتنے سنجیدہ ہو گئے تھے''رضا نے ملامتی انداز میں کہا تھا۔

"دیکھو! میں نے تو مذاق میں کہا تھا، سوچا تھا ابھی بتا دونگا لیکن اس سے پہلے ہی اُسکے دوستوں نے اُسکا قل رکھوا دیا۔ میں کیا کرتا؟''

''تو اسکا قل ہونے سی پہلے بتا دیتے۔۔۔''مقدم نے کہا۔

''سب اتنا سنجیدہ ہو چکے تھے کہ مجھے لگا، کہ اگر اب بتا دیا تو مستقیم تو بعد میں مارے گا، پہلے یہ سارے مل کے مجھے کچّا چبا جائیں گے''

''ایک بار مار کھانا تو بنتا ہے تمہارا، ایسے نہیں سدھر سکتے تم''علی نے کہا۔

''تم میرے دوست ہو کہ دشمن؟''اس نے گھورا تھا۔

''یہ آخری بار تھا حسین، دوبارہ ایسا مذاق نہ کرنا''عمر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا میرے بھائیوں! نہیں کرونگا دوبارہ، ابھی کے لیے ساتھ دے دو۔ میں آج کی کلاس تو نہیں لے سکتا ورنہ مستقیم مار دے گا، لہٰذا مجھے کیفے میں ہی بیٹھے رہنے دو۔ اور مقی تم، میری پراکسی لگوا دینا بھائی۔۔۔''اس نے اُنہیں کلاس کے لیے اٹھتا دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا دماغ خراب ہے کیا؟ پکڑا گیا نا تو تمہارے ساتھ میں بھی کلاس سے باہر ہونگا''

''آج کے لیے کر دو، دوبارہ نہیں کہونگا''اس نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

''آخری بار ہے یہ۔۔۔''مقدم نے وارن کرنے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے پھر، ہم جا رہے ہیں۔ کلاس کے بعد ملاقات ہوتی ہے''وہ لوگ چلے گئے تو حسین وہاں اکیلا رہ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر بھی سکون سے نہ گزری تھی، کہ کسی نے اُسکے سر پر زور سے تھپڑ رسید کیا تھا۔

''جنگلی ہی رہنا ہمیشہ۔۔۔''حسین نے چڑے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا کارنامہ انجام دیا ہے تم نے؟ میں نے تو جب سے سنا ہے میری ہنسی ہی نہیں رک رہی۔۔۔۔ مطلب کیسے کر لیتے ہو؟'' حور عین نے اُسکے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سن کر مزا آیا ہے، میں نے تو دیکھا ہے۔۔۔۔ہاہاہا''

''بہت غلط بات ہے ویسے یہ۔۔۔'' پاس بیٹھی ایمان کو بھی اُسکا کارنامہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔

''قسم لے لو مجھ سے میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا یہ''

''اور تم یہ اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ تمہارے وہ ٹیم میٹس کدھر ہیں؟'' ایمان کو اچانک ہی خیال آیا۔

''وہ کلاس لینے گئے ہیں'' اس نے سکون سے بتایا۔

''تم نے کیوں بنک کی کلاس؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں کرتا تو مستقیم جان سے مار دیتا''

''مار بھی دینا چاہیے تمہیں'' حور عین نے کہا۔

"حسین تمہارا آخری سال ہے، کلاسز مت چھوڑا کرو پلیز'' ایمان نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''تم فکر نہ کرو ایمان! میں بنا کلاس لیے بھی حور عین سے زیادہ مارکس لاتا ہوں''

''کیا کیا کیا؟ کب لائے مجھ سے زیادہ مارکس؟ جھوٹے نہ ہو تو'' سٹرا سے شیک پیتی حور نے تڑپ کر کہا۔

''میں ہمیشہ تم سے زیادہ ہی رہا ہوں نمبرز کے معاملے میں، یاداشت کا علاج کرواؤ اپنی'' اس نے انگلی سے اُسکا سر بجایا۔

''تمہیں تو میں ابھی بتاتی ہوں'' اس نے حسین کو مارنے کے لیے فائل اٹھائی تھی۔

''بس کرو دو تم دونوں، ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ میں سوچتی ہوں کہ اپنے دادا کے گھر میں تم لوگ اتنا عرصہ ساتھ کیسے رہے تھے؟'' کچھ سال پہلے تک حسین کے تمام تایا چچا جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے، پھر سب کے بچے بڑے ہو گئے، تو دادا نے سب کو گھر الگ کرنے کہہ دیا۔

اب دادا ہر بیٹے کے پاس کچھ ماہ رہتے تھے۔اور دیکھا جائے تو یہ ضروری تھا کہ دادا کا گھر سب کے لیے ناکافی ہو گیا تھا لہٰذا بنا کسی جھگڑے کے دادا نے خود ہی سب کو الگ کر دیا۔

''بس نہ پوچھو ایمان! کیسے جھیلا ہے میں نے پورا بچپن اس پچھل پیری کو؟'' دکھی دل سے اپنی داستان سنائی۔

''اپنا منہ دیکھا ہے بن مانس''اس نے حساب برابر کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میری کلاس ہے میں چلتی ہوں، تم ہی برداشت کرو اسے ایمان''وہ کہہ کر جانے لگی۔

''جاؤ جاؤ، اچھا ہے، میں اور ایمان کچھ دیر سکون کا سانس لیں گے''اس نے حور عین کو چڑایا، وہ بھی اسے انگوٹھا دکھاتی وہاں سے چلی گئی۔

''کیوں تنگ کرتے ہو اسے؟''ایمان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''مزا آتا ہے''

''مجھے تو تنگ نہیں کرتے تم''

''کیونکہ تم اتنی اچھی اور ڈیسنٹ لڑکی ہو، دل ہی نہیں کرتا تمہیں چھیڑنے کا''اس نے کہا تو ایمان کے چہرے پر پیاری سے مسکان آئی تھی۔

''اچھا سنو! آج بابا نہیں آئیں گے تو تم مجھے واپسی پر گھر چھوڑ دینا''

''جو آپکا حکم''اس نے تابعداری سے کہا تو ایمان ہنس پڑی۔

----------+----------+----------

یہ اُنکے گریجویشن کے آخری سال کی بات تھی ، وہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے، کتاب چہرے کے سامنے کیے پڑھ رہا تھا۔تب ہی اُسکے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔اس نے کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے، چھوٹے سے فریج کے اوپر رکھی الارم کلاک میں وقت دیکھا۔رات کے بارہ بج رہے تھے۔اس نے کچھ اچھنبے سے اٹھتے ہوئے دروازہ کھولا، سامنے ملازم کھڑا تھا۔

''رضا بھائی! بڑے صاحب آپکو بلا رہے ہیں۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں جی! شاید کوئی کام ہے''اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''اس وقت کیا کام ہے؟''وہ مزید حیران ہوا تو ملازم نے کندھے اچکا دیئے۔

''ٹھیک ہے، میں آتا ہوں۔''اس نے کہا تو ملازم چلا گیا۔

وہ اپنا سامان سمیٹ کر کوارٹر کا دروازہ بند کر کے باہر آیا، لان سنّاٹا پڑا تھا۔ لائٹس کی روشنی لان کے بیچ میں بنے سوئمنگ پول پر پڑ تیں، ماحول کو سحر انگیز سا تاثر بخش رہی تھیں۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز لان پار کر کے بنگلے میں داخل ہوا۔ باہر کی طرح اندر بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لاؤنج کے ساتھ بنے اسٹڈی روم کی لائٹس روشن تھیں، وہ یقیناً وہیں تھے۔ اس نے اسٹڈی روم کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔ وہ سامنے ہی میز پر مختلف کاغذات بکھیرے بیٹھے تھے۔ اُسے نظر اٹھا کر ناگواری سے دیکھا۔

''آؤ''انہوں نے کہا۔

''آپ نے بلایا ماموں؟''رضا نے پوچھا۔

''تم نے اپنے باپ کو فون کیا تھا؟''انہوں نے بنا تمہید کے بات شروع کی تھی۔ لہجے میں بے پناہ سختی تھی۔

''ہاں!''اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ یہ سخت لہجے سہنے کا عادی تھا۔

''کیوں؟''

''جب آپکو یہ پتہ چل گیا ہے کہ میں نے انکو کال کی تھی، تو یہ بھی پتہ چل جانا چاہیے تھا کہ کیوں کی تھی؟''چبھتا ہوا طنز کیا۔

''کیا ثابت کرنا چاہتے تھے تم اپنے باپ پر؟ ہم نے بہت برے حال میں رکھا ہوا ہے تمہیں؟ بائیک چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے''

''کیوں؟آپ نے مجھے اپنے پیسوں سے خرید کے دینی تھی؟جس کے پیسوں سے بائیک آنی تھی،اُسی کو فون کرنا مناسب سمجھا میں نے، اور کونسے اچھے حالات کی بات کر رہے ہیں آپ؟کتنے اچھے حال میں ہوں میں،وہ اس گھر کے ملازموں کو بھی نظر آتا ہے۔''اُسکے اطمینان میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا تھا۔

''بکواس مت کرو،تم خود اس خراب کوارٹر میں رہتے ہو۔ہم نے نہیں کہا تمہیں وہاں رہنے کو۔''وہ ٹیبل پر ہاتھ مارتے،کھڑے ہوئے۔وہ اور رضا اب آمنے سامنے تھے،درمیان میں بس میز حائل تھی۔

''کہا نہیں،مجبور کیا۔اپنی زبانوں سے نہیں اپنے عمل سے''

''ہم نے کچھ برا نہیں کیا۔تم ہی ہو بدزبان اور بدتمیز۔ہم نے تمہیں اپنی سگی اولاد کی طرح رکھا ہوا ہے''انکی بات پر رضا ہلکا سا ہنسا۔

''میں نے بائیک کا مطالبہ تب بھی کیا تھا،جب یونیورسٹی شروع ہوئی تھی۔آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی خراب بائیک پکڑا دی جو کہ آئے روز بند ہو جاتی ہے۔اور میرے باپ کے بھیجے گئے پیسوں سے اپنے بیٹوں کو عیاشی کروا رہے ہیں''اِس وقت کوئی رضا کو دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔یہ زہر خند لہجہ اُسکی شخصیت کا خاصہ تو نہ تھا۔

''جس باپ کا نام لے کر بہت اچھل رہے ہو،اُسی باپ سے پوچھنا تھا نا،کہ کیوں نہیں رکھا ہوا اپنے ساتھ تمہیں؟کہو اس سے کہ لے کر جائے نہ تم کو ساتھ اپنے''انہوں نے طنزیہ کہا۔

''یہ آپکا مسئلہ نہیں ہے۔آئندہ میرے باپ کے پیسوں پر عیاشی کرنے سے پہلے سوچ لیجئے گا کہ میں اب میں مزید برداشت نہیں کرونگا''

''ہونہہ۔۔۔۔خود غرض باپ کی خود غرض اولاد،تم لوگوں کو صرف لوٹنا آتا ہے''وہ پھنکارے۔

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟گھٹیا،ذلیل اور لالچی جیسے الفاظ آپکے اور آپکے خون کے لیے ہی تو بنے ہیں۔جتنے بدصورت چہرے اتنے بدصورت اعمال''پرسکون لہجے میں کہتا وہ،انکو آگ ہی لگا گیا۔

''تمہاری ماں بھی میرا ہی خون تھی۔اُسکے بارے میں کیا خیال ہیں؟''اس بار انہوں نے بھی سکون سے کہا تھا۔رضا کا سکون پل بھر میں غائب ہوا،تن بدن میں مانو آگ ہی لگ گئی تھی۔

''میری ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں؟'' سرخ آنکھوں کے ساتھ رضا نے اُنہیں وارن کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''کیا کر لوگے ورنہ؟ گھر چھوڑ دوگے؟ کہاں جاؤگے گھر چھوڑ کر؟ اپنے باپ کے پاس؟'' انہوں نے استہزائیہ انداز میں کہا تو رضا نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا سارا سامان گرا دیا تھا۔

''آگ لگا دونگا میں ساری دنیا کو'' حلق پھاڑ لہجے میں کہتا وہ ایک لمحے کے لیے اپنے ماموں کو بھی سن کر گیا تھا۔

''تباہ کر دونگا سب کو'' وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔

''پہلے خود کو آگ لگا لو، اس دنیا کا ناکارہ وجود ہو تم جسکی نہ کسی کو چاہ ہے نہ ضرورت'' اپنے پیچھے رضا کو انکا زہر آلود لہجہ سنائی دے رہا تھا پر وہ رکا نہیں، اور اسی طرح چلتا ہوا بنگلے سے باہر آ گیا۔ لان پار کر کے اپنے کوارٹر میں جانے کے بجائے، وہ سیدھا مرکزی دروازے سے باہر نکل آیا اور گلیوں میں بے وجہ پھرنے لگا۔ یہ تو تہہ تھا کے آج رات وہ گھر واپس نہیں جائے گا۔

----------+----------+----------

''اللہ پوچھے تمہیں حور! تمہاری وجہ سے آج پیدل گھر جانا پڑ رہا ہے'' حسین غائبانہ اپنی بچپن کی حریف کو کوستے ہوئے جا رہا تھا۔

''اِتنا سنسان راستہ، اوپر سے سردی، مر مرا گیا نا میں، تو حور عین صاحبہ میری موت کی ذمے دار ہونگیں'' وہ اکیلا ہی اکیلا بونگیاں مار رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس سنسان سڑک پر اُسے شدید ڈر لگ رہا تھا۔ گریجویشن کا آخری سال تھا۔ تقریباً روزانہ ہی رات کو دوستوں کے ساتھ اکھٹے بیٹھ کر اپنے فائنل ایئر پروجیکٹ پر کام کرنا پڑتا تھا۔ صبح اُسکا کسی بات پر حور عین صاحبہ سے ٹاکرا ہو گیا تھا، جسکا بدلہ اس نے حسین سے غدّاری کی صورت میں لیا تھا۔ اور جا کر اپنے چچا یعنی حسین کے والد کو اُسکے پچھلے ہفتے ہونے والے، بائیک کے حادثے کی خبر نشر کر دی تھی، جو کہ سراسر حسین کی ہی لاپرواہی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ نتیجتاً اُسکے ابّا نے نہ صرف بائیک اور گاڑی دونوں ضبط کی تھیں بلکہ اُسکے دوستوں کو بھی باری باری فون کھڑکا دیا کہ خبردار! جو موصوف کو پک اینڈ ڈراپ دینے کی کوشش کی، تین چار دن پیدل گھر آئیگا تو احساس ہو گا کہ پیسے کتنی محنت سے کمائے جاتے ہیں۔ اور ایسے وقتوں کا تو دوست انتظار کرتے ہیں۔ ایسے ایسے فرمانبردار نکل کر سامنے آتے ہیں کہ کیا ہی اپنے ماں باپ کے ہوں۔ عمر کے اندر تھوڑی بہت انسانیت جاگی تھی جسے علی نے ڈپٹ کر سلا دیا تھا کہ

"انکل نے کہا ہے نو پک اینڈ ڈراپ تو اسکا مطلب ہوتا ہے نو۔۔۔"اُسکے بعد مابدولت حسین صاحب اپنے دوستوں کو ٹھیک ٹھاک برا بھلا کہہ کر پیدل ہی سفر پر روانہ ہو گئے، کہ گھر تو واپس جانا ہی تھا۔اور سارے بے شرم، ذلیل دوست کھڑے ہنستے رہیں۔اُن چاروں کو جی بھر کر کوسنے کی بعد اب وہ غائبانہ ہی حور عین کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ جس سڑک پر وہ تھا، وہ باقی سڑکوں کے نسبت زیادہ سنسان تھی کیونکہ اُسکی ایک جانب قبرستان تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، آگے کا راستہ پھر بھی پر رونق تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا، اُسکی دائیں طرف قبرستان کی لمبی دیوار تھی۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔"زیر لب پڑھتا وہ غلطی سے بھی دائیں جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔اسی اثناء میں اُسے ایک ہیولہ نظر آیا۔

"یااللہ خیر !استغفرُاللہ"پڑھنے میں تیزی آئی، وہ ہیولہ مزید آگے بڑھتا ہوا سٹریٹ لائٹ کی روشنی کے نیچے پہنچا تو حسین چونک اٹھا۔ وہ رضا تھا۔آج ایف وائی پی (فائنل ائیر پروجیکٹ) پر کام کرنے کیلئے، اس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر وقفہ لیا تھا۔لہٰذا صرف وہی پانچوں، آج مقدم کے گھر جمع ہوئے تھے۔اور اب وہاں سے واپسی پر اُسے، وہ یہاں راستے میں نظر آیا تھا۔رضا نے اُسے نہیں دیکھا تھا بلکہ خاموشی سے چلتا ہوا قبرستان میں داخل ہو گیا تھا۔اُس نے حیرت سے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، جو رات کے ایک بجا رہی تھی۔

"رات کے اِس وقت یہ قبرستان میں کیا کرنے گیا ہے؟"اُس نے خود کلامی کی۔

"کہیں یہ۔۔۔چلہ تو نہیں کاٹ رہا آج کل"اس نے سوچا اور اگلے ہی لمحے جھرجھری لی۔

"توبہ استغفراللہ ! کیسی باتیں کر رہا ہوں میں بھی؟"خود کو سرزنش کرتا آگے بڑھا۔اب ہر صورت اُسے رضا کے پیچھے جانا تھا۔خوف سارا اُڑن چھو ہو چکا تھا۔وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا قبرستان میں داخل ہوا۔ گُھپ اندھیرے میں بھی اُسے رضا ایک قبر کے پاس دونوں زانو بیٹھا دکھائی دیا، وہ آہستہ سے اُسکے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"آخر یہ کیوں آیا ہے یہاں؟"وہ حیران تھا۔رضا قبر کی مٹّی پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اُسکے پیچھے کھڑا حسین بلکل خاموش تھا۔

"امی !"سنّاٹے میں رضا کی آواز گونجی۔

"امی ! میری پیاری امی !"اس نے پھر کہا۔

''امی آپ۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز بھرا گئی۔ حسین کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو، کی مصداق ساکت کھڑا رہ گیا۔

''آپ۔۔ کیوں چلیں گئی؟۔۔۔ سب'' وہ سسکا۔ حسین کو قدموں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔

''سب چلے جاتے۔۔۔ بے شک، پر آپ تو نہ جاتیں'' وہ رو رہا تھا، قبر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کسی نے کہا تھا کہ جھوٹے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں لڑکے روتے نہیں ہیں، کوئی پوچھنے والا چاہیے۔

بس کوئی پوچھنے والا، جسکے آگے دل کھول کر رکھا جا سکے۔

اور وہ تو بس ماں ہی ہوتی ہے۔

ماؤں کے لاڈلے، پوری دنیا سے لڑ کر۔

سب سے ہار کر۔

اور زندگی سے تھک کر۔

وہیں تو آتے ہیں، اُسکے پاس جو بن پوچھے ہی دل کا حال جان لیتی ہے۔

اور اُسکے دل کا حال پوچھنے والی تو منوں مٹی تلے تھی۔

وہ پھر بھی اُنکے پاس آیا تھا۔ اپنی ماں کے پاس۔

تو کیا ہوا جو وہ بول نہیں سکتی؟

اُسے گلے نہیں لگا سکتی؟

پر اُسے سن تو سکتی ہیں نا؟ یقیناً دیکھ بھی سکتی ہیں۔

حسین سن سا کھڑا رہا گیا۔ رضا کو اس نے سب سے بہترین پایا تھا، لیکن اتنا ہی پر اسرار، سیپ میں قید موتی کی طرح۔۔۔ حسین کو روتے ہوئے کو تسلی دینا نہیں آتی تھی، اُسے چپ کروانا، منانا کچھ بھی تو نہ آتا تھا۔ وہ تو بس ہنستے کھیلتے زندگی گزارتا تھا، لیکن اس نے رضا کو دوست

بنایا تھا۔ اور دوستی کا تقاضا تھا کہ اُسے دلاسہ دینا تھا۔ کیا ہوا جو اُسکی ماں نہیں تھی۔ پر دوست تو تھا نا؟ ماں کا نعم البدل نہ تھا۔ لیکن ایک اچھا سامع تو بن سکتا تھا۔ ایک مرد ہی تو مرد کو سمجھ سکتا ہے۔

وہ اُسکے برابر آ بیٹھا، خاموشی سے، رضا نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آنسوؤں کے بوجھ سے پلکیں گرنے کو تھیں۔ حسین نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس سے پہلے کے وہ کچھ کہتا رضا خود ہی اُسکے گلے لگ کر رو پڑا۔

رضا رو رہا تھا۔۔ اور حسین ساکت۔۔

اُسے توقع نہ تھی کے وہ ایسے بکھر جائے گا۔ حسین اُسکا کندھا سہلاتا رہا۔ اس وقت اُسے نہ قبروں سے خوف آ رہا تھا نہ سنّاٹوں سے وحشت۔ رو رو کر جب وہ تھک گیا تو اس سے الگ ہوا لیکن حسین نے دوبارہ اُسے ساتھ لگا لیا۔

''اٹھو! یہاں سے چلتے ہیں۔ بہت رات ہو چکی ہے'' اُس نے اُسکا بازو سہلاتے ہوئے کہا تو، اُس نے آنسو صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ حسین نے اُسے ہاتھ دے کر اٹھایا اور پھر اُسکے کندھے میں بازو ڈالے اُسے قبرستان سے باہر لے کر آیا۔ وہ اُسے خود سے الگ نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے رضا نے اپنے کندھے سے اُسکا ہاتھ ہٹایا اور ''مجھے اکیلا چھوڑ دو'' کہتا دوسری جانب چل دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''کیوں چھوڑ دوں؟ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟'' حسین ایک ہی جست میں اُسکے سامنے آیا۔

''تم جاؤ جہاں جا رہے تھے، مجھے گھر جانا ہے، میں خود چلا جاؤں گا'' رضا نے اب کے لہجے کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''تو آؤ ساتھ ہی چلتے ہیں'' اُس نے پھر سے کندھے میں بازو ڈال کر، اُسے ساتھ لگانا چاہا تو اب کی بار وہ بپھر گیا۔

''کہاں ناں! نہیں ضرورت ہے کسی کی'' وہ غصّے سے کہہ کر اب مخالف سمت مڑ گیا۔

''لیکن مجھے تو ہے، دیکھو مجھے اس سنسان سڑک پر ڈر لگ رہا ہے، ایسا کرو تم مجھے گھر تک کمپنی دے دو'' حسین نے اُسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس کسی کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے'' اُس نے بنا مڑے، بنا رکے جواب دیا۔

''تو چلو احسان ہی کر دو میری ذات پر'' وہ بھی بنا رکے اُسکے پیچھے آ رہا تھا۔

''میں نے کہاناں مجھے اکیلا چھوڑ دو''

''کیوں اکیلا چھوڑ دوں ؟انسان اکیلا رہنے تو نہیں آیا دنیا میں''سنسان سڑک پر اپنے سے آگے آگے چلتے رضا کو، وہ بڑی فرصت سے جواب دے رہا تھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ،اُسکے پیچھے آتے، حسین نے یہ ٹھان لی تھی کہ آج تو نہیں چھوڑے گا اُسے۔۔۔

''میں اکیلا ہی رہنے آیا ہوں اس دنیا میں، میں اکیلا آیا تھا اور اکیلا ہی چلا جاؤنگا، کسی کی بھی ضرورت نہیں مجھے۔''رضا نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ہاں ! ہم تو مجمع لیکر آئے تھے اُس دنیا میں ،اور بارات ساتھ لیکر واپس جائینگے، بس ایک تم ہی اکیلے آئے ہو''حسین اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ بلآخر رضا رکا اور مڑ کر اُسے ناراضگی سے دیکھا۔

''مسئلہ کیا ہے ؟''حسین اُسکے بلکل قریب آگیا تھا۔

''مجھے کیا مسئلہ ہوگا بھلا؟ سوائے اسکے کہ مجھے بھوک لگی ہے اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ تم میرے ساتھ آؤ گے۔اب تم بے شک دنیا میں اکیلے آئے ہو، لیکن میں تو دس پندرہ لوگوں کے ساتھ آیا ہوں ناں ! مجھ سے تو اکیلے کھانا نہیں کھایا جائے گا''حسین نے لفظ اکیلے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آخر تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے مجھے''رضا نے تھک کر درخواست کی۔

''کھانا کھالو پھر چھوڑ دونگا''حسین نے اُسکا بازو پکڑتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ گھسیٹا تھا۔اب کے رضا خاموش رہا، وہ، اُسے لیے پر رونق علاقے کی طرف آیا، یہاں ہلکی پھلکی گھما گہمی تھی۔ پھر ایک ریسٹورنٹ جانب بڑھا۔

''مجھے گھر جانا ہے''رضا نے ریسٹورنٹ کے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔

''چپ کر کے چلتے رہو''حسین نے اُسے آنکھیں دکھائیں اور گھسیٹتا ہوا ریسٹورنٹ کے اندر لے گیا۔رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اکا دکا عوام نظر آرہی تھی۔ رضا کو ایک میز پر بٹھا کر وہ کھانے کا آرڈر دینے چلا گیا۔آرڈر دے کے وہ واپس اُس کے پاس آ بیٹھا۔

''حسین ! مجھے واقعی بھوک نہیں ہے''رضا نے اُسے دیکھ کر بیچارگی سے کہا۔رونے کی وجہ سے اُسکی ناک سرخ ہو چکی تھی۔

''مجھے تو ہے، اور میرا ساتھ دینے کے لیے تم بھی تھوڑا کھا لینا'' اس نے بے نیازی سے کہا، اب کے رضا خاموش رہا۔ کافی لمحات اسی خاموشی میں سرک گئے۔ پھر رضا نے نظریں اٹھا کر حسین کو دیکھا، وہ ہتھیلی کی مٹھی بنائے، اُسے ہونٹوں پر ٹکائے، اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ رضا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر جیسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہنا ہے؟ دو تین بار اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا آواز ساتھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' حسین نے نرمی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''رضا! جو بھی بھرا ہوا ہے نا اندر، اُسے باہر نکالو، جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔ اس فرسٹیشن (چڑچڑاپن) کو ختم کرو'' حسین نے کہا۔ جبکہ رضا کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

''تم نے کبھی نہیں بتایا کہ تمہاری امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ بھی نہیں بتاتے کے باقی گھر والے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کچھ تو بتاؤ رضا! کچھ اپنے بارے میں، شاید میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں'' وہ سنجیدہ تھا۔

''کوئی کچھ نہیں کر سکتا'' اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''اگر کچھ نہ بھی کر سکوں، تب بھی تمہارا دل تو ہلکا ہو گا''

''بہت بوجھ ہے اس دل پر، ایسے ہلکا نہیں ہو گا'' وہ تلخی سے ہنسا اور گلاس وال سے باہر دیکھنے لگا۔ سڑک پر اکا دکا ٹریفک تھی۔

''تو اِس بوجھ کو بانٹ لو، کچھ کم تو ہو گا'' حسین نے اُسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔ یہ کہیں سے وہ حسین نہیں لگ رہا تھا، جو سارا دن الٹی سیدھی حرکتوں میں ملوث پایا جاتا تھا۔ رضا چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا

''تم کیا کرو گے سن کر؟'' حسین گہری سانس لے کر، پیچھے ہو بیٹھا۔

''میں سن کر وہ نہیں کر سکتا جو تم کہہ کے کر سکتے ہو۔ میرے دادا کہتے ہیں، کہ انسان مٹّی سے بنا ہے۔ جس طرح مٹّی کا غبار ہمیشہ بارش کے بعد بیٹھ جاتا ہے اور مطلع صاف ہو جاتا ہے، پھر ہر شے روشن اور صاف دکھنے لگتی ہے۔ اسی طرح مٹّی کے بنے انسان کے دل کا غبار بھی

جب بڑھ جائے، تو اُسے روکے، کبھی کہہ کے تو کبھی لڑ کے ہی صحیح، لیکن یہ غبار نکال دینا چاہیے۔ پھر دل بھی صاف ہو جاتا ہے اور ذہن بھی'' پتہ نہیں کیوں پر حسین کو سننا اُسے اچھا لگ رہا۔

''ماں یاد آتی ہے، ہر گھڑی، بلکہ وہ تو کبھی بھولتی ہی نہیں۔ لیکن جس طرح تم رات کے اس وقت انکی قبر پر آئے ہو، کچھ تو غلط ہوا ہے جو اتنی رات کو تمہیں وہ یاد آئی ہیں۔ وہ بھی اس شدت سے کہ تم وقت کا لحاظ کیے بغیر ہی انکے پاس چلے آئے۔'' حسین کے کہنے پر اُسے پھر سے کچھ گھنٹوں قبل ہونے والا اپنا اور ماموں کا جھگڑا یاد آیا تھا، وہ اب بھی خاموش رہا۔ جب حسین کو یقین ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں بولے گا تو وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے باہر دیکھنے لگا۔ ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔

''میری امی۔۔۔'' رضا کی آواز نے فضاء میں چھایا سکوت توڑا، حسین پھر سے سیدھا ہوا۔

''میری امی، میری پیاری امی۔۔۔ وہ بہت پیاری اور بہت خوبصورت عورت تھیں۔ وہ دنیا کی سب سے حسین عورت تھیں۔ لیکن شاید۔۔۔ ایسا بس مجھے لگتا تھا، میرے ابّو کو نہیں۔ وہ ساری عمر اُنکو یہی کہتے رہے کہ تم اتنی کالی اور کم صورت ہو کہ میرا تمہیں دیکھنے تک کو بھی دل نہیں کرتا۔'' وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں بول رہا تھا۔ آنکھیں اُسکی دور خلا میں موجود ماضی کو تلاش رہی تھیں۔ ماضی قریب آ رہا تھا اور وہ اُسے واضع دیکھ رہا تھا۔

----------+----------+----------

''اتنی دیر سے کیوں گھر آئے ہو؟'' رضا کی دادی نے واصف صاحب سے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کام تھا'' انہوں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ تمہارا روز روز کا تماشا کب ختم ہو گا؟ تمہاری بیوی روزانہ کھانے پر انتظار کرتی ہے اور تم اتنی اتنی رات گئے گھر آتے ہو اور کھانا بھی باہر کھا کر آتے ہو۔ کیوں کر رہے ہو ایسا؟''

''کس لیے گھر آؤں؟ اس بدصورت عورت کے لیے؟ اُسکی کالی شکل دیکھنے کے لیے گھر آؤں؟ اُسکا خیال آتے ہی میرا گھر ہی آنے کا دل نہیں کرتا'' جاہلوں کی طرح بولتے اس وقت وہ کہیں سے بھی پڑھے لکھے نہیں لگ رہے تھے۔

''وہ سادہ مزاج، معصوم عورت ہے، اور تم اُسے بد صورت کہہ رہے ہو؟ آنکھوں پر سے پٹّی اُتار کر دیکھو۔ کتنے خوبصورت نین نقوش ہیں اُسکے۔ بس رنگت سانولی ہے اور وہی تو اُسے پر کشش بناتی ہے'' انہوں نے برہمی سے کہا۔

''ایک منٹ۔۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے یا آپکی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، اِس اُجڈ عورت نے؟ ہونہہ۔۔۔ پر کشش۔۔۔'' انہوں نے اپنی ماں کے پیچھے کھڑی اپنی بیوی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ نم آنکھیں لیے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

''آپ لائی تھیں نا اسے؟ آپ ہی کھایا کریں اسکے ساتھ کھانا'' وہ غصّے سے کہتے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گئے۔

''بیٹی! وہ یقیناً کسی بات پر پریشان ہو گا ورنہ ایسی باتیں کبھی نہیں کرتا'' رضا کی دادی نے اپنی بہو کے ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں خالہ! مجھے پتہ ہے'' انہوں نے نرمی سے انکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ اس سارے منظر کو رضا ڈرائنگ روم کے پردے کے پیچھے سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ تقریباً روزانہ ہی اپنے باپ کو ایسی بدزبانی کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا، کہ آج پہلی بار وہ اُسکی دادی کے سامنے بھی یہ ساری بات کہہ گئے تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے رضا کی ماں کو انکے کالے رنگ کا طعنہ دیتے تھے۔ اور وہ بیچاری چپ کر کے سب سہتی جاتی کہ میکے کے نام پر ایک ہی بھائی تھا اور وہ بھی انکے حال سے بے نیاز۔۔۔

اُس دن کے بعد سے واصف صاحب، اپنی ماں کے سامنے بھی رضا کی ماں کو انکی شکل وصورت کا طعنہ دینے لگے۔ ایک دن صبح ناشتے پر انکی ماں نے کہا کہ

''واصف! بہو کو آفس جاتے ہوئے اُسکے بھائی کے گھر چھوڑ دینا۔ بہت دنوں سے نہیں گئی ہے یہ'' دادی نے برتن سمیٹتی رضا کی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمم۔۔۔'' اُنہوں نے فقط اتنا ہی جواب دیا۔ رضا کو اُسکی امی، آملیٹ کے ٹکڑے کر کے دے رہی تھیں۔

''میں پندرہ منٹ بعد نکل جاونگا'' انہوں نے رضا کی امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بس پانچ منٹ دیں، میں تیار ہو کر آتی ہوں'' اُنہوں نے عجلت میں کہا۔

''تیار ہونے سے کونسا فرق پڑ جائے گا تمہیں''اُنکی طنزیہ انداز میں کہے جملے سے اُنکا سارا جوش ماند پڑ گیا،اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ چھے سالہ رضا انکے پیچھے پیچھے کمرے میں آیا، جہاں وہ آنسو صاف کرتے ہوئے،اپنا پرس کندھوں پر لٹکا رہی تھیں۔ وہ آکر انکے پیروں سے لپٹ گیا۔

''رضا! کیا ہوا بیٹا؟''وہ پریشان ہوئی۔

''امی!''وہ روتا رہا۔

''مجھے بتاؤ تو کیا ہوا ہے؟ کسی نے ڈانٹا ہے؟''وہ پنجوں کے بل اُسکے سامنے بیٹھیں۔

"امی! آپ بہت پیاری ہیں۔۔۔آپ بہت ساری پیاری ہیں''وہ روتے ہوئے معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

''آپ بہت پیاری ہیں۔ آپ رویا مت کریں''وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انکے آنسو پونچھے لگا۔ وہ بھونچکارہ گئیں۔ حتٰی کہ یہ چھوٹا سا بچہ انکا دکھ،اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا،اور ایک اسکا باپ تھا۔اُنہیں لگا کسی نے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔ انہوں نے رضا کو خود میں بھینچ لیا۔

''میں جا رہا ہوں'' باہر سے واصف صاحب کے چلانے کی آواز آرہی تھی، مگر اب اُنہیں کوئی پروانہ تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور رضا کا ہاتھ تھامے باہر چل پڑیں۔

----------+----------+----------

وہ ایک خوفناک رات تھی۔ رضا نے اس رات سے پہلے کبھی اپنی ماں کو شوہر سے اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا۔ ہمیشہ اُسکا باپ ہی چیختا چلاتا تھا، لیکن اس رات اُسکی ماں اور باپ میں شدید جھگڑا ہو رہا تھا۔ رضا لاؤنج کے صوفوں کے پیچھے چھپا بیٹھا سب سن رہا تھا۔ جھگڑے کی وجہ سمجھ میں نہ آرہی تھی۔ اُسکی دادی کے انتقال کو دو ماہ ہو چکے تھے اور انکے جانے بعد تو واصف صاحب جیسے اور شیر ہو گئے تھے۔ رضا کی ماں کا اکلوتا حامی بھی جا چکا تھا۔ اُنکی موت کے بعد سے وہ بات بے بات اپنی بیوی کو ذلیل کرتے، حتٰی کہ اب وہ گالم گلوچ پر بھی اتر آئے تھے۔ وہ خاموشی سے سب سہتی رہتی، پر کچھ نہ کہتی۔

پر نہ جانے آج ایسا کیا ہوا تھا؟ جو وہ اس طرح اُن سے لڑ پڑی تھیں۔ دونوں کی آوازیں کمرے سے باہر آ رہی تھیں۔ رضا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جھگڑوں کی آواز میں تیزی آنے لگی، پھر ایکدم ہی چٹاخ کی آواز سنائی دی، پھر اُسکی ماں کے رونے کی آواز آئی۔

''زبان دراز عورت! تُو روکے گی مجھے؟ تُجھے دیکھ کر تو جانور نہ رکنا چاہے تیرے پاس، اس قدر بدصورت شکل کے ساتھ کیسے مجھے روک رہی ہے تُو؟'' رضا کا باپ اُنہیں مارتا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ اُنہیں کس کام سے روکنا چاہتی تھیں؟ بہر حال، یہ احتجاج اُنہیں بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ لاتیں، گھونسے، تھپڑ سب مار رہے تھے۔ اور رضا کی ماں کی چیخیں آسمان چھو رہی تھیں۔ وہ کمزور تھیں، آگے سے کچھ کر بھی نہ پا رہی تھیں۔ اس ساری صورتحال میں رضا دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے رو رہا تھا۔ اُن آوازوں سے بچنے کے لیے اُس نے کان بند کر لئے تھے لیکن سب بے سدھ۔۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور واصف صاحب تن فن کرتے گھر سے باہر نکل گئے۔ انکے جانے کے بعد رضا ڈرتے ڈرتے اٹھا اور انکے کمرے میں آیا، اُسکی ماں فرش پر بے دم سی پڑی سسک رہی تھیں۔ اُن میں تو رونے کی ہمت بھی نہ بچی تھی۔

''امی! امی! میری پیاری امی'' رضا بھاگتے ہوئے آیا اور اُن سے لپٹ گیا۔ انکے رونے میں تیزی آ گئی۔

''امی! امی! میری پیاری امی!'' وہ روتا جاتا اور کہتا جاتا تھا۔ وہ پوری رات اُن ماں بیٹے نے روتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ رات رضا کی زندگی کی خوفناک ترین رات تھی، لیکن اس رات کے بعد آنے والا دن اُس سے بھی کہیں زیادہ بدترین تھا۔ اگلے دن صبح اُسکی ماں نے اُسے اسکول کے لیے تیار کیا، وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ماں سے بحث بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیے خاموش رہا۔ اُسکی ماں نے اُسکے لیے لنچ تیار کر کے بیگ میں رکھا اور اُسے بہت سارا پیار کر کے وین میں بٹھایا۔ عموماً وہ اُسے وین میں بٹھانے کے بعد گھر کے اندر چلی جاتی تھیں۔ لیکن آج اندر نہیں گئی، بلکہ دروازے پر ہی کھڑی وین کو دور جاتا دیکھتی رہیں۔ رضا انکو ہاتھ ہلاتا رہا اور وہ رضا کو یہاں تک کہ وین انکی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

----------+----------+----------

''امی بہت شرارتی تھیں'' رضا بولتے ہوئے اچانک ہی مسکرایا۔ نظریں اُسکی اب بھی گلاس وال کے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ویٹر کچھ دیر قبل ہی کھانا میز پر رکھ کر گیا تھا۔

''اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ کسی پردے کے پیچھے، تو کسی دروازے کے پیچھے چھپ جاتیں اور مجھے جب کافی دیر وہ نظر نہ آتی تو میں اُنہیں ڈھونڈتا، جب وہ مجھے کہیں نہ ملتی، تو میں رونے لگ جاتا، یہاں تک کہ مجھے روتا دیکھ، وہ ہنستے ہوئے باہر نکل آتی۔ کبھی جب میں اُنہیں بہت تنگ کرتا تھا، تب وہ اچانک سے نیچے گر جاتی اور آنکھیں بند کر کے مرنے کی اداکاری کرتیں، میں اُنہیں اٹھاتا پر وہ نہ اٹھتیں، جب بار بار اٹھانے پر بھی وہ نہ اٹھتیں، تو میں پھر رونا شروع کر دیتا۔ اور وہ ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔ وہ ایسے ہی سارا دن میرے ساتھ کھیلتیں، شرارتیں کرتی تھیں۔ وہ بہت پیاری تھیں۔'' وہ خواب سی کیفیت میں کہہ رہا تھا، جبکہ حسین بلکل خاموش تھا۔ کھانا پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا، پر دونوں میں سے کسی نے اس پر نظر تک نہ ڈالی تھی۔

''اُس دن بھی میں نے اُنہیں اٹھایا تھا، کئی بار۔۔۔ مجھے لگا۔۔۔ مجھے لگا وہ مذاق کر رہی ہیں۔۔ پر'' اُسکی آواز بھرا رہی تھی۔

''میں رویا۔۔۔ مجھے لگا ابھی اٹھ جائینگی۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ نہیں اٹھیں۔۔۔'' وہ بے ربط سی گفتگو کر رہا تھا۔ حسین کچھ کچھ بات سمجھ رہا تھا۔ رضا نے اذیت سے آنکھیں میچیں، وہ جیسے پھر سے وہی بچہ بن گیا تھا۔ وہی چھے سال کا بچہ، وہ پھر اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔

----------+----------+----------

اُس روز اسکول میں اُسکا کچھ بھی کرنے کو دل نہ کیا تھا۔ وہ کلاس کا سب سے تیز اور ذہین بچہ تھا۔ اُسکی خاموشی اور غائب دماغی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔ تقریباً ہر ٹیچر نے ہی اُس سے سبب جاننے کی کوشش کی تھی، پر چھے سال کی عمر میں بھی وہ جانتا تھا کہ گھر کا پردہ رکھنا ہے، اس نے کسی سے رات والے واقعے کا ذکر نہیں کیا، بس چپ رہا۔ دوپہر کو چھٹّی کے بعد جب وین اُسے لینے آئی، تو اُسکا حقیقی معنوں میں گھر جانے کا دل نہیں چاہا تھا۔ وہ بچہ تھا، اپنی بے چینی کو رات والے واقعی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔ بہر حال گھر تو اسے جانا تھا، سو وین میں بیٹھ گیا۔ پورے راستے بچے وین میں ہلا گلہ کرتے رہے، پر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ چپ تو وہ ہمیشہ سے رہتا تھا، مگر آج تو ارد گرد کا جیسے ہوش ہی نہ تھا۔

''رضا بیٹا! آپکے گھر کے باہر رش کیوں ہے؟'' وین ڈرائیور نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا، تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ گھر کے دروازے پر محلے والے کھڑے تھے۔ وہ ناسمجھی سے اُنہیں دیکھتا ہوا وین سے اُترا۔ اتنے سارے لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کافی لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ اگر کوئی بات بھی کر رہا تھا، تو اتنے آہستہ آواز میں کے آواز

صرف اُن دو کے درمیان ہی رہے۔ وہ بچہ تھا، اپنی عمر کے باقی بچوں کے نسبت اُسکی سمجھ بوجھ زیادہ تھی۔ اُسے یاد تھا کہ ایسا رش آج سے دو ماہ قبل دادی کے انتقال پر بھی ہوا تھا۔ لیکن اس سے آگے وہ سمجھ نہیں پایا کیونکہ اُسکے ماموں نے اُسے دیکھ لیا تھا، اب وہ تیزی سے اس تک آرہے تھے۔

''آگئے بیٹا؟ چلو اندر آؤ'' وہ پیار سے اُسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''السلام وعلیکم'' اس نے ماموں کو سلام کیا۔

''''ولی بیٹے! رضا کو اسکی پھوپھو کے پاس لے جاؤ'' انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اب جا کر رضا نے دیکھا تھا کہ وہاں صرف ماموں نہیں بلکہ اسکے اور بھی رشتے دار موجود تھے، ماموں کا بڑا بیٹا اُسکا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانے لگا، اُسکی آنکھوں سے لگتا تھا کہ ابھی ابھی رو کر آیا ہوں۔

''ولی بھائی! آپکو کسی نے ڈانٹا ہے؟'' رضا نے اُسکے ساتھ چلتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''نہیں! کسی نے نہیں ڈانٹا'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ رو کیوں رہے ہیں؟'' ولی اُسکے مشاہدے پر حیران رہ گیا۔ خود وہ رضا سے آٹھ سال بڑا تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات ہے'' وہ جلدی سے کہتے ہوئے، اُسے اُسکی پھوپھو کے پاس لے آیا۔ اُسے دیکھتے ہی اُسکی پھوپھو نے اُسے گلے لگایا، گھر میں اور بھی بہت سارے لوگ موجود تھے، ایسے بھی جنہیں رضا جانتا تھا اور ایسے جنہیں اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔

''پھوپھو! امی کہاں ہیں؟'' رضا نے اُن سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بھوک لگی ہوگی ناں میرے بچے کو؟ جاؤ کپڑے بدل لو، میں کھانا لے آتی ہوں'' یہ اُسکے سوال کا جواب نہیں تھا۔

''پہلے امی کے پاس جانا ہے''

''بیٹا! تم جا کر کپڑے بدلو، کھانا تمہیں کمرے میں مل جائے گا۔ کھا کر سو جانا جب تک ہم نہیں بلائے باہر نہ آنا'' پیچھے سے اُسکے ماموں کی آواز آئی۔

''پر ماموں! میری امی؟''اس نے پھر پوچھا۔

''بیٹا! امی باہر گئی ہیں تمہاری، تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔ چلو اب تم جاؤ''اُنہوں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا، اب کے وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں جاکر بھی اُسے سکون نہیں آیا۔ وہ سو سکا نہ ہی کھانا کھا سکا۔ وہ اپنی امی کے بنا کبھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ باہر سے وقتاً فوقتاً رونے کی اور کبھی کبھی بین کرنے کی آوازیں آنے لگتی۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا، لیکن کمرے سے باہر نہیں جاتا کہ اُسے ماموں نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔ اسی طرح بہت سا وقت گزر گیا، اُسے نیند آنے لگی تو وہ سو گیا۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر سویا ہو گا؟ اُسکی آنکھ اُسکی پھوپھو کی بیٹی کی آواز پر کھلی تھی۔ اُسکی اٹھائیس سالہ پھوپھوزاد اُسے اٹھا رہی تھی۔ اپنی امی کے بعد اگر رضا کو کوئی پسند تھا تو وہ یہی تھیں، وہ رضا سے بہت پیار کرتی تھیں۔

''کیا ہوا عائشہ جی؟''اس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ اُنہیں عائشہ باجی کہنے کے بجائے ''عائشہ جی'' کہتا تھا کہ بچپن میں اُسکے منہ سے لفظ باجی ادا نہ ہوا تھا، پھر اُسکی عادت ہی بن گئی۔

''اٹھو رضا! تمہاری امی آگئی ہیں۔''انکی آواز بھرائی تھی، لیکن رضا نے محسوس نہیں کیا۔

''امی آگئیں''وہ خوشی سے چہک اٹھا، اور وہ سسکی، اس نے اب بھی محسوس نہ کیا بلکہ بستر سے اچھل کر اترا اور ننگے پاؤں باہر بھاگا۔

''رضا! رضا رکو''عائشہ جی اُسکے پیچھے بھاگیں۔

''امی! امی کہاں ہیں آپ؟''وہ بھاگتے ہوئے خوشی سے اُنہیں آوازیں دے رہا تھا۔ باہر بیٹھے اور کھڑے لوگوں نے دکھ سے اُسے دیکھا۔

''امی! میری پیاری امی'' وہ پورے گھر میں بھاگتا، اُنہیں ڈھونڈ رہا تھا اور عائشہ جی اُسکے پیچھے پیچھے، اُسے روکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ گھر کے ہر کونے میں اُنہیں ڈھونڈتا جاتا، دیکھنے والے ساکت کھڑے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر اُسے روکتا۔ بلآخر وہ خود ہی رکا۔ عائشہ جی ہانپتے ہوئے اُسکے پاس آئیں۔

''عائشہ جی! امی کہاں ہیں؟''اس نے کچھ بے چینی سے پوچھا، تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے اُسکے قریب آئیں۔ اُسکا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

''رضا! تمہاری امی اب نہیں آئیں گی۔اُنہیں اللہ نے اپنے پاس بلا لیا ہے'' وہ روتے ہوئے بولیں۔

''نہیں! نہیں مجھے میری امی چاہیے، عائشہ جی! میری امی کہاں ہیں؟ مجھے میری امی چاہیے'' وہ اُنکا ہاتھ جھٹک کر پہلے چیخا، پھر وہ رویا، اللہ کے پاس جانے کا مطلب اُسے پتہ تھا۔

''آؤ میرے ساتھ'' وہ اُسکا ہاتھ تھام کر اُسے وہاں لے گئیں، جہاں اُسکی ماں کی لاش کچھ دیر قبل ہی لا کر رکھی گئی تھی۔

''وہ رہی تمہاری امی، انکو آخری بار دیکھ لو۔ پھر اُنہیں جانا ہے'' وہ رضا کو لاش کے قریب لے آئیں۔

''امی! میری پیاری امی'' وہ بھاگتے ہوئے کھاٹ کے قریب گیا۔اُسکی ماں ہمیشہ ایسے مذاق کرتی تھیں، لیکن یہ اتنے جلدی سچ کیسے ہو گیا؟ صبح تو وہ رضا کو پیار کر رہی تھیں، اُسکا لنچ بنا رہی تھیں، اُسکی کتابیں بیگ میں رکھ رہی تھیں، اُسکے بال بنا رہی تھیں تو اب کیا ہوا؟ اب اچانک سے کہاں چلیں گئی؟ وہ چپ کیوں تھیں؟ وہ بول کیوں نہیں رہی تھیں؟ اُنکی آنکھیں بند کیوں تھیں؟

سفید کفن میں لپٹی اُسکی ماں اس وقت کتنی پر سکون لگ رہی تھی۔ رضا سارا رونا دھونا بھول گیا۔اور یک ٹک انکے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔۔ ساکت سا۔۔۔ حیران سا۔۔۔ اتنا پیارا چہرہ۔۔۔ اتنا پر نور چہرہ۔۔۔

یہ اُسکی ماں کا تھا؟

کیا مرنے کے بعد لوگ اتنے پیارے ہو جاتے ہیں؟

وہ انکے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہاں کھڑا ہر وجود مجسم حیرت تھا۔ کچھ لمحوں پہلے اسکو قابو کرنا مشکل تھا۔اور اب وہ اتنا پر سکون کیسے ہو گیا؟ جیسے کوئی غم ہی نہ لگا ہو۔

اُسکی ماں کے چہرے کا سارا سکون اُسکے دل میں اتر رہا تھا۔ آس پاس کھڑے لوگوں میں جنبش ہوئی، اب رخت سفر باندھنا تھا۔ رضا خاموش۔۔۔

لوگ آگے بڑھے، مردے کو لیکر جانا بھی تھا۔۔۔

اُسے اب رخصت ہونا تھا۔۔۔ لیکن رضا کا وجود بے حس و حرکت۔۔۔۔

چلو اب اسے الوداع کہہ دو، ایک آخری الوداع۔۔۔ کسی نے رضا کے کان میں کہا۔

کسی نے آگے بڑھ کر چہرے پر کفن ڈال دیا، اُسکی ماں کا خوبصورت چہرہ چھپ گیا۔

شور تھا ہر جانب، اب رضا کا باپ بھی لاش کو کندھا دے رہا تھا۔ مگر رضا ساکت۔۔۔ نہ کچھ کہا۔۔۔ نہ رویا۔۔

''رو لو بیٹا! رو لو، تمہاری ماں اب نہیں آئیگی''

وہ اب خوابوں میں ملیں گی۔۔۔

وہ تصویروں میں نظر آئیں گی۔۔۔

وہ جا رہی تھیں، دروازے سے جنازہ باہر جا رہا تھا۔ رضا دیکھ رہا تھا، خالی خالی نظروں سے، کیا وہ گھر واپس نہیں آئینگی؟

ہاں! وہ نہیں آئینگی، اب وہ کبھی نہیں آئیں گی۔ وہ قبر میں کیسے رہیں گی؟ رضا کی باتوں کا جواب کہاں سے دیں گی؟ وہ اُنہیں کہاں ڈھونڈے گا؟

اور جنازہ چلا گیا۔ اب وہ کہیں نہیں تھیں۔ نہ کچن میں نہ کمرے میں، نہ گھر کے صحن میں۔۔

وہ دنیا میں کہیں نہ تھیں۔۔۔۔

''امی! میری پیاری امی'' ایک آخری سسکی لبوں سے نکلی، اور وہ بے دم سا فرش پر ڈھے گیا۔

حسین کو اپنے گالوں پر نمی محسوس ہوئی، اُسکی آنکھوں سے آنسو خود بخود باہر آ رہے تھے۔ رضا ویسے ہی ریسٹورانٹ کے شیشے سے باہر نظر آتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''جب امی چلیں گئی، تو مجھے پتہ تھا کہ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی لیکن۔۔۔'' اس نے شیشے کی جانب سے چہرہ موڑ کر حسین کو دیکھا۔

''لیکن؟'' حسین نے آہستہ سے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج وہ سب کچھ کہہ دے۔ سب کہہ کر وہ اپنا دل ہلکا کر لے مگر آج کے بعد خود پر اتنا بوجھ لے کر نہ گھومے۔ سارا نہ صحیح کچھ تو غم ہلکا کر لے اپنا۔

''لیکن حسین، میں چھوٹا تھا۔ بہت چھوٹا۔۔۔ بچہ تھا میں، کہیں نہ کہیں مجھے لگتا تھا کہ سب جھوٹ ہے۔ امی واپس آجائیں گی۔ میں اکیلے گھر میں چلا چلا کہ روتا کہ شاید۔۔۔ شاید وہ کسی پردے کے پیچھے سے نکل آئیں گی، اور ہنستے ہوئے کہیں گی کہ وہ مذاق کر رہی ہیں، پر ایسا نہیں ہوتا۔ میں روتے روتے خود چپ ہو جاتا۔ پھر اگلے دن دوبارہ وہی سب کرتا کہ شاید امی آجائیں۔ میں تو بچہ تھا، لیکن لوگ دن بدن مجھے پاگل سمجھنے لگے۔ مجھے روز روز ایسے چلا چلا کر روتے دیکھ، ایک دن عائشہ جی، نے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ قبرستان، امی کی قبر پر بھیج دیا۔ اس دن میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ امی مر چکی ہیں'' وہ کچھ دیر خاموش ہوا پھر بولا۔

''جب میں نے سمجھوتہ کر لیا کہ اسی غم کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے، تب میرا باپ مجھے چھوڑ کر چلا گیا'' وہ رکا۔

''کیوں؟'' حسین نے پوچھا، وہ رضا کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا، ماں کا ذکر کرتے ہوئے جو دکھ وہاں تھا، باپ کا ذکر کرتے ہوئے وہ نفرت میں بدلنے لگا۔

----------+----------+----------

چار دن، فقط چار دن لگائے تھے اُسکی باپ نے دوسری شادی کرنے میں، یقیناً اُسی عورت سے، جس کی خاطر اُسکی ماں اُسکے باپ سے اُس رات لڑی تھی۔ پہلی اور آخری بار۔۔۔

شادی ہو گئی، نئی آنے والی کو اپنا سوتیلا پن دکھانے کا موقع بعد میں ملا، اس سے پہلے ہی اُسکے اپنے باپ نے اُسے، اُسکے ماموں کے گھر چھوڑ دیا۔ وہ بھی اپنی ماں کا ہی بیٹا تھا۔ کوئی سوال، کوئی شکایت نہ کی۔ خاموشی سے انکے گھر چلا آیا۔ وہاں سب کچھ مناسب ہی تھا۔ چھٹیوں پر وہ اُسے واپس گھر لے آتے۔ جہاں رضا، کسی کونے میں سامان کی طرح پڑا رہتا۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ ایک رات، جب وہ اپنے باپ کے گھر رہنے آیا ہوا تھا، تب اس نے اپنی سوتیلی ماں کو باپ سے بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ اپنے بیٹے سمیت کینیڈا ہجرت کرنے کا کہہ رہیں تھی اور رضا کے باپ کو اُسکی فکر تھی۔

''آپ اُسکا سالانہ خرچہ دے دیا کیجیئے گا، پھر تو اُن لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ رہنے دیں اُسے وہیں۔''

''پر وہ میرا بڑا بیٹا ہے'' انہوں نے بیچارگی سے کہا تھا۔ شاید اُنہیں زندگی میں آج پہلی بار یاد آیا تھا، کہ اپنی ماں کے جیسے کھڑے نین نقش لیکن ہو بہو ماں کی جیسی ہی رنگت رکھنے والا رضا، انکا بھی بیٹا ہے۔

''پر میرے بھائی کا وہ کچھ نہیں لگتا۔ میرے بھائی نے مجھے اور میرے بیٹے کو سپانسر کیا ہے اور آپ میرے شوہر ہیں تو ساتھ میں آپکو بھی شہریت مل جائیگی، مگر رضا کے لیے آپکو انتظار کرنا ہوگا۔ اور میں اتنا اچھا موقع نہیں جانے دے سکتی۔ اُسکے ننھیال والوں کی بھی تو ذمے داری ہے۔ وہ رکھیں اُسے''

''مگر۔۔۔۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، پر انکی بیگم نے بات کاٹ دی۔

''اگر مگر کچھ نہیں، اگر آپ نہیں آئے تو میں اپنے بیٹے کو لے کر اکیلے چلی جاؤں گی'' رضا بوجھل قدموں سے واپس پلٹ گیا۔ جانتا تھا کہ یہ آخری دھمکی کتنی اثر رکھتی ہے اُسکے باپ پر۔ رضا کو اس گھر سے نکال کر اپنے ماموں کے گھر چھوڑنے پر بھی اسی دھمکی نے اُسکے باپ کو آمادہ کیا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جسکی اُمید تھی۔ وہ چلے گئے، اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ، جاتے ہوئے وہ رضا کو اُسکے ماموں کے گھر چھوڑنے آئے تھے، ہمیشہ کے لیے۔ پورے راستے وہ خاموش رہا لیکن جب وہ اُسکا سامان گاڑی سے ماموں کے گھر کے سامنے اُتار رہے تھے تب۔۔۔۔

''ابو! مجھے آپکے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے مت چھوڑیں یہاں'' اس نے پر امید لہجے میں کہا۔ اُسکے باپ نے ایک نظر اُسے دیکھا اور خاموشی سے واپس چہرہ موڑ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب کچھ بھی کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بہت خوددار تھا، اس نے دوبارہ اپنے باپ سے کچھ نہیں کہا۔

اس دن رضا نے تیسرا جنازہ دیکھا تھا۔ اُسکے باپ کا جنازہ۔ وہ بھی تو اُسے چھوڑ کر ہی جا رہے تھے۔ ہمیشہ کے لیے، کبھی نہ واپس آنے کے لیے، رضا کے لیے اُسی دن انکی موت بھی ہو گئی تھی۔

وہ چلے گئے تھے۔۔۔

اُسکے ماموں کے گھر تو وہ پہلے ہی دو سال سے رہ رہا تھا۔ لیکن اب وہ مستقل وہاں کا رہائشی بن گیا تھا۔ کب تک؟ اُسے خود بھی نہیں معلوم تھا، ماموں اور انکے گھر والے جنکا رویّہ پہلے اُسکے ساتھ اچھا نہ سہی تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ پر اب وہ کھل کر سامنے آئے تھے۔ جب اُسکے ابّو نے کینیڈا جا کر پہلی بار رضا سے بات کرنے کے لیے فون کیا، تو اس نے انکار کر دیا۔ اُسکے بعد سے جتنے بھی فون آتے، رضا کے علم میں لائے بغیر ہی انکار کر دیا جاتا۔ وہ بچہ تھا، کچھ دن کا غصّہ تھا اُسے، پر اپنے باپ کی ضرورت رکھتا تھا۔ لیکن اُسے ہر بار بتایا جاتا کہ تمہارا باپ وہاں جا کر

بھول گیا ہے تمہیں۔ کچھ حد تک یہ بات درست بھی تھی۔ کینیڈا سے فون کا سلسلہ چند مہینوں میں بتدریج کم ہوتے ہوتے بلکل ہی ختم ہو گیا۔ البتہ پیسے ہر ماہ باقاعدگی سے آتے اور رضا کے علم میں لائے بنا ہی استعمال ہو جاتے۔

کچھ عرصے بعد اُسکے ماموں نے اپنا گھر کرائے پر دے دیا اور رضا کے ابّو کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ جو اُسکے باپ کے جانے کے بعد سے خالی پڑا تھا۔ اس گھر میں آ کر اُسے کچھ اچھا محسوس ہوا تھا، وہ اُسکی ماں کا گھر تھا۔ رضا اپنا سامان لے کر اپنے کمرے میں گیا لیکن۔۔۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اُسکے کزن نے ناگواری سے اس سے پوچھا۔

''میں اپنے کمرے میں آیا ہوں؟''

''تمہارا کمرہ؟'' وہ حیران ہوا اور پھر غصّے سے اپنی امی کو آوازیں دینے لگا۔

''امی، امی! یہاں آئیں جلدی'' رضا بیچارہ تو بوکھلا گیا تھا۔

''ارے! کیا ہوا؟''

''یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اسکا کمرہ ہے'' اس نے شکایت کی

''کیا مطلب اس بات کا؟ یہ میرے بیٹے کا کمرہ ہے'' اُنکی تیوری پر بل پڑے۔

''کوئی بات نہیں مامی! میں کسی دوسرے کمرے میں رہ لونگا'' وہ ممانی کو غصّے میں دیکھ کر گھبرا گیا۔

''ہونہہ۔۔۔'' انہوں نے اتنا ہی کہا۔ پر رضا کو نہیں معلوم تھا کہ اس گھر کے کسی دوسرے کمرے تو کیا، کسی کونے میں بھی اُسکی جگہ نہیں ہے۔ پہلی رات ہی اُسے کوارٹر بھیج دیا گیا تھا۔ کہا گیا کہ گھر میں کچھ رنگ و روغن کے کام کی وجہ سے جگہ نہیں بن پا رہی تو آج رات وہ یہاں گزار لے، بھلا ایک چھوٹے سے بچے کو کتنی جگہ چاہیئے تھی گھر میں؟ وہ رات اس نے کس طرح ڈر ڈر کے گزاری تھی؟ بس وہ ہی جانتا ہے۔ ساری رات وہ اپنی ماں کو یاد کر کے روتا رہا۔ اُس رات کے بعد کسی رات بھی اُسے گھر کے اندر جگہ نہ ملی، شروع میں وہ کہتا تو وہ لوگ بہانہ بنا دیتے۔ پھر جیسے اُسے عادت ہوتی چلی گئی۔

سالوں گزر گئے پر اُسکے کے حالات میں تبدیلی نہ آئی، اُسے ایک ایک چیز کے لیے ترسایا جاتا۔ اُسکے باپ کے پیسوں پر عیاشی کرنے والے اُسے یہ احسان جتاتے کہ اُسکا خرچہ وہ لوگ اٹھا رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے سب سنتا۔ کبھی اف تک نہ کرتا۔۔۔ پتہ نہیں اتنا صبر کہاں سے لایا تھا وہ؟ شاید اپنی ماں کی طرح ہی صابر تھا۔ ایک مرتبہ وہ سلینڈر پر چائے رکھ کر باہر لان میں آیا تھا۔ یہ اُسکی قسمت تھی کہ سلینڈر اُسی وقت پھٹا تھا۔ پورے کوارٹر میں آگ لگ گئی۔ اُسکے بعد بھی کسی کو احساس نہ ہوا۔ اُسی خستہ حال کوارٹر کو رنگ کر کے رضا کے حوالے کر دیا گیا۔ نئی گیس کی لائن ڈالی گئی نہ ہی دروازوں اور کھڑکیوں کو بدلا گیا۔ رضا تب بھی خاموش۔۔۔۔

لیکن آج اس نے اپنے باپ کا نمبر کسی طرح حاصل کر لیا۔ وہ انکے آفس کا نمبر تھا انکی سیکریٹری نے فون اٹھایا۔ اس کے کہنے کے مطابق ہر ماہ ایک خطیر رقم رضا کے نام پر اُسکے ماموں کے اکاؤنٹ میں بھیجی جاتی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ اُسکا دماغ ہی گھوم کر رہ گیا۔ آج اُسکا صبر جواب دے گیا تھا۔ کتنے چہرے تھے ان لوگوں کے؟ وہ غصّے میں اپنے ماموں سے بھڑ گیا تھا اور جواب میں جو باتیں انہوں میں اُسے سنائی تھیں وہ رضا کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ مزید کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہتا تو کسی گستاخی کا مرتکب ہو جاتا۔ اسی لیے گھر سے نکل آیا۔ لیکن اس نے یہ تہہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی کے آگے نہیں جھکے گا۔ اپنے حق پر کسی کو غاصب بننے نہیں دے گا۔

گھر سے غصّے میں نکلا وہ چلتے چلتے قبرستان آگیا، وہ اکثر ایسے ہی قبرستان آجاتا تھا۔ اپنی ماں کے پاس آکر اُسے سکون ملتا تھا۔ مگر آج وہ رو پڑا تھا۔ ایسے میں نامعلوم حسین کہاں سے آگیا تھا؟ وہ زبردستی اُسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔ جو باتیں اُس نے کسی سے نہ کہیں تھیں۔ وہ آج حسین سے کہہ ڈالیں۔ وہ تھک گیا تھا، اپنے اندر رکھ رکھ کر، اُسے بھی کوئی سامع چاہیے تھا۔ وہ بھی اس طوفان کو باہر نکالنا چاہتا تھا۔

کھانا کب کا سامنے رکھا ٹھنڈا ہو گیا تھا، پر دونوں نے ہی ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اب رضا چپ تھا۔ حسین کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے؟ اُسکی کس کس بات پر اُسے تسلی دے؟

"کچھ کھالو رضا!" کافی دیر بعد اس نے رضا کو مخاطب کیا۔ خلاف توقع اس نے بنا کسی بحث کے کھانا شروع کر دیا تو حسین نے سکھ کا سانس لیا۔ خود بھی خاموشی سے کھانا کھاتے حسین نے کئی بار رضا کو دیکھا تھا۔ وہ پھر ویسا ہی ہو گیا تھا، گم صم سا، خاموش سا، اپنے خول میں بند۔

"مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" حسین نے اچانک ہی پوچھا تو منہ میں چمچ کی مدد سے نوالہ ڈالتے اُس کا ہاتھ رکا اور اس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میرا مطلب، ظاہر ہے تم نے اُن خود غرض لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا لیکن پہلے اپنے پیروں پر کھڑا بھی تو ہونا ہے''

''تم سے کس نے کہا کہ مجھے ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا؟''اس نے پلیٹ میں چمچ واپس رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مطلب؟''حسین سمجھ نہیں سکا۔

''مطلب یہ کہ مجھے ان لوگوں سے واسطہ رکھنا ہے، دشمنی کا، انتقام کا۔اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونا ہے ہی مجھے، لیکن۔۔۔ان سے سب کچھ واپس لینا ہے۔یہ گھر جس میں یہ لوگ رہتے ہیں، میری دادی نے میری ماں کے نام کیا تھا۔اور وہ میرا ہے، مجھے ان سے وہ گھر واپس لینا ہے۔اور وہ تمام پیسہ جو میرے باپ سے یہ لوگ میرے نام پر بٹورتے رہے ہیں، وہ سود سمیت واپس لینا ہے مجھے ان سے اور وہ بھی ایک ساتھ، یہ کیسے واپس کرتے ہیں وہ میرا مسئلہ نہیں۔میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔نہ ماموں کو نہ انکے بیوی بچوں کو، سب سے باری باری بدلا لونگا، اور اس فہرست میں میرے باپ کا نام سب سے پہلے ہے۔کیونکہ وہ میری ماں کا قاتل ہے۔''بہت آہستہ، اور بہت سرد مہری سے کہتا وہ حسین کے رونگھٹے کھڑے کر گیا تھا۔وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا منصوبہ تھا اُسکے دماغ میں؟ کیا کرنے والا تھا وہ؟ اسکا جواب حسین کے پاس نہیں تھا البتہ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ رضا سچ کہہ رہا ہے۔اُسکی آنکھوں میں انتقام کی جو آگ تھی وہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم جو کرنا چاہتے ہو ضرور کرنا، پر ابھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔کچھ وقت کے لیے بھول جاؤ اُن سب کو، کم از کم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک۔''حسین نے آرام سے سمجھایا۔

''ہاں! ابھی تو میں کچھ بھی نہیں کرونگا، پہلے مجھے اپنے لیے کچھ کرنا ہے، چاہئے اُسکے لیے مجھے خود غرض کیوں نہ بننا پڑے۔''وہ سختی سے کہتا اب پلیٹ میں رکھے چاولوں کو یہاں وہاں کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، تمہارا حق بھی ہے۔لیکن ابھی غصّہ ٹھنڈا کرو اور گھر جاؤ۔اور پلیز، گھر جا کر اُن سے کوئی بحث مت کرنا''حسین نے اُسکا غصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ہمم۔۔۔''اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔حسین نے سکھ کا سانس لیا۔اُسکے ارادوں سے وہ خود بھی ڈر گیا تھا۔

----------+----------+----------

''کیا تم میری جان نہیں چھوڑوں گے ؟'' ریسٹورنٹ سے واپسی گھر آتے ہوئے بھی حسین اُسکے ساتھ ساتھ تھا۔ رضا نے آج تک کسی سے نہ اپنا راز بانٹا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں میں سے کسی کو گھر لایا تھا۔ ''غصّہ کیوں کر رہے ہو اتنا؟'' تاریخ گواہ تھی کہ حسین کو کسی بات سے کبھی کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

''غصّہ نہیں کر رہا، میرا گھر آ گیا ہے تو اب تم جاؤ'' وہ جھنجھلایا۔ پوسٹ اوور شیئرنگ گلٹ (Post oversharing guilt) جذبات میں آ کر سب بتا تو دیا لیکن اب اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔

''کیا مطلب ؟ میں نے تمہیں کھانا کھلایا ہے، تم مجھے چائے بھی نہیں پلاؤ گے ؟'' دنیا بھر کی معصومیت اور مسکینیت چہرے پر طاری کی، رضا دانت کچکچا کر رہ گیا۔ جانتا تھا کہ وہ جان نہیں چھوڑے گا۔ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، جب حسین نے سننا ہی نہیں ہے تو روکنے کا کیا فائدہ ؟

لان پار کر کے وہ اپنے کوارٹر تک آیا اور رک کر پیچھے دیکھا، ایک اُمید کہ شاید وہ چلا گیا ہو، لیکن وہ بھی فرصت سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے اُسکے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ سر جھٹک کے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ پھر دروازے پر رک کر بولا۔

''میں اندر نہیں بلاؤں گا تمہیں، اتنی قابل ذکر جگہ نہیں ہے یہ'' تلخی سے کہا۔

''تم سے اجازت کس نے مانگی ہے ؟'' اسکو پیچھے دھکیلتے ہوئے خود ہی اندر داخل ہوا۔ رضا بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

اس قید خانے جیسے کمرے میں واقع کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔ لیکن حسین بڑے آرام سے پاؤں پسارے، اُسکے پلنگ پر ڈھیر ہوا۔

''چلو شاباش ! جس چیز کا وعدہ کیا تھا وہ دو مجھے۔۔۔''

''میں نے کون سا وعدہ کیا؟'' رضا نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''چائے پلانے کا'' وہ بھی سکون سے بولا۔

''مفت میں نہیں ملتی چائے، سلینڈر میں گیس بھرنی پڑتی ہے۔'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنی گیس خرچ ہو جائیگی آخر؟'' وہ بھی بڑا ڈھیٹ تھا۔ رضا بیزاری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس سے بحث کرنا واقعی فضول تھا۔ جتنی دیر میں اُس نے چائے تیار کی، اتنی دیر حسین کچھ نہ کچھ بک بک کرتے اُسکا دماغ کھاتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنی پریشانی بھول بھال گیا۔

''تمہاری چائے'' اب کے ذرا تمیز سے بات کی تھی۔ چائے کی پیالی بھی، اس کوارٹر جیسے حالات پیش کر رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہوا لیکن حسین نے بڑے آرام سے کپ لیا اور چائے کے گھونٹ بھرے۔

''آدمی اچھے ہو تم، بس دماغ کے ٹیڑھے ہو'' حسین نے شرارت سے کہا۔

''سوری! دماغ گھومارہتا ہے آج کل'' اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوا تو بولا۔

''بس کر دو یہ مظلوم ہیروئن والی حرکتیں، میرے سامنے تو بلکل یہ شکل مت بنانا ورنہ ایک جھانپڑ لگا کر سیدھا کر دوں گا'' رضا ہنس پڑا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

''اب فضول باتوں کو ذہن سے نکال کر صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ بدلہ لینے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے'' اُس نے پھر سمجھانا چاہا۔ رضا نے بس سر ہلا دیا تھا۔ اُسکے بعد کافی دیر وہاں بیٹھے، اُس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، جب اُسے لگا کہ اب رضا پہلے سے کافی بہتر ہے، تو جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ فجر ہونے والی تھی، رضا اُسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ باہر آتے ہوئے اُسکی نظریں لان میں فون کان سے لگائے، ٹہلتے ہوئے ماموں پر پڑیں تو چہرے کے تاثرات میں واضح ناپسندیدگی در آئی۔

''یہ تمہارے ماموں ہیں؟'' حسین نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بڑی ہی کوئی خبیث چیز ہیں ویسے۔۔۔'' حسین کے برجستہ تبصرے پر وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

''اب میں پیدل گھر جاؤں؟'' اُسکا موڈ بہتر دیکھ کر اُس نے دنیا جہاں کی معصومیت چہرے پر سمو کر پوچھا۔

''آؤ چھوڑ دوں تمہیں۔'' رضا نے بائیک کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ ویسے بھی کچھ دیر گھر سے دور رہنا چاہتا تھا، یہ اچھا طریقہ تھا۔

اُس روز رضا کے دل میں حسین کا مقام اور مرتبہ مزید بلند ہو گیا تھا۔

----------+----------+----------

دن تیزی سے گزر رہے تھے، اُنہوں نے گریجویشن مکمل کرلی تھی۔ ماسٹرز کے لیے عمر نے اپنی فیلڈ تبدیل کرتے ہوئے ملٹی میڈیا آرٹس کا انتخاب کیا تھا۔ کچھ مصروفیات کے باعث وہ داخلہ فارم لینے نہ جاسکا، تو اُسکا فارم بھی علی اپنے ساتھ ہی لے آیا، لیکن جمع کروانے اُسے خود ہی جانا تھا۔ لہٰذا وہ مقدم کے ساتھ آج جامعہ آیا ہوا تھا۔ گھنٹے بھر کی محنت کے بعد وہ فارم جمع کروانے میں کامیاب ہو پایا۔ اِس تمام عرصے میں مقدم اُسے کمپنی دیتا رہا تھا۔ اب دونوں سر درد کے باعث کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''تمہیں یاد ہے؟ پچھلے دنوں ہم نے سیلاب متاثرین کی امداد کے فنڈز اکھٹے کیے تھے'' مقدم نے اچانک ہی پوچھا۔ تو عمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سب سے زیادہ امداد رضا کی طرف سے آئی تھی اُس روز''

''یہ تو اچھی بات ہے'' عمر کو سمجھ نہ آیا کہ وہ اُسے یہ بات کیوں بتا رہا تھا؟

''اچھی بات تو ہے، لیکن تم جانتے تو ہو کہ اُسکی فیملی اُسے سپورٹ نہیں کرتی۔ وہ خود ہی اپنے اخراجات اٹھاتا ہے۔ اتنے زیادہ پیسے دینا، اُسکے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں پوچھ بیٹھا کہ یہ صرف تمہارے پیسے ہیں یا کسی اور نے بھی ساتھ بھیجے ہیں۔ تو معلوم ہے اس نے کیا کہا؟'' وہ رکا۔

''کیا؟''

''اس نے مجھے بتایا کہ وہ آٹھویں جماعت سے پیسے جمع کر رہا ہے اور اُن پیسوں کو اُس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نے پوچھا کس لیے جمع کیے تھے؟ تو کہنے لگا کہ میں ایک گھر بنانا چاہتا ہوں، جہاں میں اُن بچوں کو رکھوں گا، جنہیں اُنکے ماں باپ disowned (مطرود) کر دیتے ہیں یا جو اپنے کسی رشتے دار کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، اور وہ لوگ بس مجبوری میں اُنہیں اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہوں۔ میں ایسے لوگوں کو کہونگا کہ نہ کریں اُن بچوں پر یہ احسان، مجھے دے جائیں، میں پال لونگا اُنہیں۔ کم از کم آپکے گھر میں رہتے ہوئے، روزانہ جو انکی خودداری، انا اور عزت نفس مجروح ہوتی ہے، وہ تو نہ ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ یعنی تم یتیم خانہ کھولنا چاہتے ہو؟ تو کہنے لگا نہیں! یتیم خانے تو بہت ہیں، میں انکے لیے گھر بنانا چاہتا ہوں۔ اس گھر میں وہ سب فیملی کی طرح رہیں گے۔ اپنی مرضی سے زندگی گزاریں گے، اپنی پسند کا

پہنیں گے۔لوگوں کی اُترن یا بھیک پر نہیں پلیں گے وہ بچے۔''اس نے ساری بات بتائی تو عمر حیرت زدہ رہ گیا۔رضاایساسب کچھ سوچتا تھا؟اور کتنا گہرا تھاوہ؟کتنا؟اتناکہ شاید اُسکی گہرائی میں اتارنا ناممکن تھا۔

''پتہ ہے عمراس نے مجھ سے کیا کہا؟کہنے لگا کہ مجھے نہیں معلوم یہ کام کرنے میں کتنا عرصہ لگے؟شاید بیس سال یا تیس سال لیکن یہ میں اپنے پیسوں سے،اپنی کمائی سے کرونگا کسی کی امداد یا صدقات سے نہیں۔وہ پیسے جو میں نے جمع کیے تھے،اُسکا ایک حصہ میں نے یہاں دے دیا ہے۔اللہ نے چاہاتو دوبارہ جمع ہو جائیں گے۔لیکن یہ میں ضرور کرونگا''مقدم نے آہستہ سے اُسکے الفاظ دہرائے۔رضا کے لیے جو عقیدت آج اُسکے لہجے میں تھی،وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی عمر نے۔ بہت دیر انکے درمیان خاموشی چھائی رہی،مقدم چائے کے کپ پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔جبکہ عمر کے خیالات کی رو بھٹک بھٹک کر بس رضا پر ہی جارہی تھیں۔

''آغا!''اس نے مقدم کو پکارا۔

''ہونہہ۔۔۔''اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے اُسے دیکھا۔

''رضا بہت پراسرار سا نہیں لگتا؟وہ اپنے گھر والوں کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرتا۔اور کبھی کبھی بہت تلخ ہو جاتا ہے۔ہر وقت ایسا ہی رہتا ہے،اُداس سا۔یعنی۔۔۔میں سمجھ نہیں پاتا کہ وہ ایسا کیوں ہے؟''

''اسکی باتوں کا ماخذ تو یہی لگتا ہے کہ اُسکی فیملی کا رویہ صحیح نہیں ہے اُسکے ساتھ،تبھی تو وہ اتنا نالاں ہے سب سے،لیکن عمر!ہم اُسے زیادہ کرید بھی نہیں سکتے۔مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے۔میں اتنے اچھے انسان کا دوست ہونے کا اعزاز کھونا نہیں چاہتا۔''آج مقدم کے دل میں رضا کا احترام مزید بڑھ گیا تھا۔

''اللہ،اُسے اُسکے ہر مقصد میں کامیاب کرے''عمر نے دل سے دعا کی تھی۔

''آمین''مقدم نے کہا تھا۔

----------+----------+----------

لیلیٰ کی پڑھائی شروع ہونے کے بعد ہی مقدّم کی گریجویشن کا اختتام ہو گیا تھا۔ چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ سوات چلا گیا، اپنی دادی کے گھر۔ اب لیلیٰ کی طرف سے اُسکی فکر ذرا کم ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی سادگی اور معصومیت سے مقدم کی ماں اور اپنے تعلقات بہت بہتر کر لئے تھے۔ اور مقدم کو یقین تھا کہ آنے والوں وقتوں میں وہ امّاں کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ جتنا وہ مقدم کے لیے کر رہی تھی، اس سے مقدم کی نظروں میں اُسکی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ وہ دل سے اُسکی قربانیوں کا قدر دان ہو چکا تھا۔

دوسری طرف وہ پھوپھو کے گلے شکوے دور کرنے میں بھی کافی حد تک کامیاب ہو رہا تھا۔ سوات سے واپس آنے کے بعد پڑھائی ایک بار پھر سے شروع ہو چکی تھی اور اس بار پہلے سے زیادہ محنت طلب تھی۔ اُس نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا تھا، سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ درمیان میں پھوپھو نے لیلیٰ کی شادی کا شوشہ چھوڑ دیا۔ انکا کہنا تھا کہ جتنا پڑھنا تھا، پڑھ لیا اتنا اچھا رشتہ آیا ہے اُسکے لیے، وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیں؟ یہ صورت حال کافی پریشان کن تھی۔ لیلیٰ کا تو رو رو کر برا حال تھا۔

''یار! تم رو تو مت، اتنی مشکلوں سے صحیح، ہم نے اپنے بڑوں کے تعلقات بہتر کر دیے ہیں نا۔ ہم آگے بھی سب ٹھیک کر لیں گے'' وہ اُسے تسلی دے رہا تھا، لیکن وہ تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''نہیں مقدم! امی نہیں مانیں گی۔ اب کیا ہو گا؟'' اس نے روتے ہوئے پوچھا، تو اُس نے سر پیٹ لیا۔

''میں نے کہا تو ہے کہ میں سب ٹھیک کر لونگا۔ بھروسہ رکھو مجھ پر'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، تو وہ سوں سوں کرتی ہوئی چپ ہوئی۔

''دیکھو اب تک میں نے سوائے ابّا کے کسی کو نہیں بتایا تھا گھر میں، یہ میری ہی غفلت ہے، لیکن اب میں امّاں سے بات کرنے لگا ہوں۔ اب تو انکا دل بھی تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔'' اس نے دوبارہ سے اُسے تسلّی دی تو وہ کچھ لمحے اُسے یونہی دیکھتی رہی۔

''مانا کے میں بہت ہینڈسم ہوں لیکن اتنا بھی نہ گھورو مجھے کہ نظر ہی لگ جائے'' اس نے شرارت سے کہا تو لیلیٰ نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔

"ممانی زبان کی تیز ہیں، پر دل کی بری نہیں ہیں۔ پچھلے ایک سال میں، میں نے دیکھا لیا ہے اُنہیں۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے، کبھی مجھ سے میری پسند پوچھ کر میرے لیے کھانا بناتی ہیں۔ کبھی میرے لیے کپڑے سینے بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن بس امی سے خار کھاتی ہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھے بہو کے طور پر قبول کرینگی بھی یا نہیں؟'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہمم۔۔۔اسکا حل ہے میرے پاس''اس نے پر سوچ انداز میں کہا۔

''کیا؟''

''بس تم ایسے ہی روتی رہو اور امّاں کے آنے تک چپ نہ ہونا''

''ہیں؟''وہ حیران ہوئی۔

''بس جو کہا ہے وہ کرو''اتنی دیر میں مقدم کی ماں وہاں آ گئیں۔

''آئے ہائے! کیا ہو گیا؟''اُسکی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر وہ چونکی۔

''پھوپھو نے اسے سوات واپس بلایا ہے''مقدم نے جواب دیا۔

''ہاں تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ چھٹیاں ہیں، جا کر مل آؤ''وہ دوپٹہ سر سے اتارتی، صوفے پر بیٹھیں۔ شاید وہ ابھی ابھی باہر سے آئی تھیں۔

''پھوپھو نے اسکے لیے بہت اچھا رشتہ دیکھ لیا ہے۔ بقول انکے ایسا رشتہ بار بار نہیں ملے گا''

''ہیں؟ یہ کب ہوا؟ مجھے تو نہیں بتایا''وہ حیران ہوئیں۔

''آپ کو بھلا کیوں بتائیں گی؟ انکو پتہ ہے نا کہ آپ یقیناً مخالفت کرینگی''اس نے اصل بات کا آغاز کیا تھا۔

''میں کیوں مخالفت کروں؟ انکا مسئلہ ہے۔''مقدم گڑبڑا گیا۔ لیلیٰ پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔

''ارے میرا مطلب جب آپکو پتہ چلے گا کہ وہ لیلیٰ کی پڑھائی چھڑوا کر اُسکی شادی کروا رہی ہیں، تو آپ تو اس چیز کو غلط کہیں گی نا''

''شادی ابھی ہو رہی ہے؟''وہ مزید حیران ہوئیں۔

''ہاں تو اور کیا؟ پھوپھو کا بس نہیں چل رہا، اگلے مہینے ہی رخصت کر دیں اسے۔ کیوں لیلی؟''اس نے لیلیٰ کو بھی گفتگو میں شامل کیا تھا۔ جو رونا دھونا چھوڑ کر اب اُسے ہی گھور رہی تھی۔ مقدم نے مسکراہٹ ضبط کی۔

''ہائے بیٹی! اب کیا کر سکتے ہیں؟ تمہاری ماں کو کون سمجھائے؟''انہوں نے عام سے انداز میں اُسکی دل جوئی کی۔اُسی لمحے لیلیٰ نے اچانک ہی نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا۔بلیو جینز پر ڈارک براؤن شرٹ پہنے وہ واقعی بہت پیارا لگ رہا تھا۔مزاج میں ہر وقت شرارت گھلی رہتی تھی۔ اوراس سے بھی زیادہ فخر تواُسے اس بات پر تھا کہ یہ شخص اُسکا دیوانہ تھا۔اور جو اگر وہ اُسکا نہ ہو سکا تو؟ وہ اُسکا نہ بھی ہوا لیکن کیا خود وہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزار پائے گی؟ یہ خیال آتے ہی آنکھوں میں آنسو دوبارہ اُمڈ آئے تھے۔وہ یکدم ہی اٹھی اور روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔مقدم اور اُسکی امّاں جو اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے،اُسکے اس طرح اچانک روتے ہوئے جانے پر حیران ہوئے۔

''بیچاری،اتنی اچھی بچی ہے۔یقین ہی نہیں آتا تمہاری پھوپھو کی بیٹی ہے''اُسکی ماں نے افسوس سے کہا۔بس یہی موقعہ تھا جب مقدم کو لگا کہ اُسے اپنی چال چل ہی دینی چاہیے۔باقی اللہ مالک ہے۔

''ہاں! ابّا بھی یہی کہہ رہے تھے۔انہوں نے تو پھوپھو کو سمجھانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پھوپھو نے بس یہی کہا کہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکلنے نہیں دیں گی''

''تمہارے ابّا کی تو وہ سنتی ہی کہاں ہے؟ بس اپنی کرتی رہتی ہے۔ ہماری کوئی عزت ہی کہاں اُسکی نظروں میں؟''انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور نہیں تو کیا؟ ابّا تو سوچ رہے تھے کہ لیلیٰ کا رشتہ مانگ لیں میرے لیے،تاکہ یہ مسئلہ ہی ختم ہو۔لیکن میں نے ہی منع کر دیا''بڑا ہی خطرناک جوا کھیلا تھا اُس نے۔

''ہیں ہیں؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟''وہ کچھ حیران،کچھ پریشان سی بولیں۔

''کل ہی کی بات ہے۔ابّا نے صرف سوچا تھا یہ،پھر مجھ سے ذکر کیا۔اس سے پہلے کہ وہ آپ سے مشورہ کرتے میں نے ہی منع کر دیا۔''

''کیوں منع کیا تم نے؟''مزید حیران ہوئیں۔

''کیا فائدہ امّاں؟ آپکا نام سنتے ہی پھوپھو نے انکار کر دینا ہے۔ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آپکے بیٹے کو اپنا داماد بنائیں؟ وہ کسی چرواہے سے شادی کروا دینگی لیلیٰ کی پر آپکے بیٹے سے نہیں''اُس نے چہرے پر خاصے افسوس ناک تاثرات بھرے۔

''ارے! ایسے کیسے انکار کرے گی؟ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے؟ اکلوتا ہے، اچھی تعلیم حاصل کر رہا ہے، ساتھ ساتھ کماتا بھی ہے۔ روشن مستقبل ہے اُسکا'' انکے اندر کی ماں جاگی تھی، اور یہی مقدم چاہتا تھا۔

''ایسا آپکو لگتا ہے۔ ورنہ آپ کہہ کر اپنا منہ خالی کرینگی، وہ صاف انکار کر دیں گی آپکو'' اس نے ترپ کا پتہ پھیکا تھا۔ اب بس فیصلہ ہونا تھا۔

''اُسکی مجال مجھے انکار کرے؟ میں آج ہی تمہارے ابّا سے بات کرتی ہوں۔ دیکھتی ہوں، کیسے منع کرتی ہیں تمہاری پھوپھو؟ لیلیٰ تو اب میری ہی بہو بنے گی'' وہ عزم سے کہتی اٹھیں اور جلدی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں، تاکہ مقدم کے ابّا سے بات کر سکیں۔

''بس؟ یہ اتنا آسان تھا؟'' مقدم حیران بیٹھا تھا۔ واقعی؟ یہ اتنا آسان تھا؟ اُسکے بعد جو اُس نے ہنسنا شروع کیا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُسے یاد آیا تھا کہ لیلیٰ یہاں سے روتے ہوئے گئی تھی۔ وہ جلدی سے اُسکے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔

اُسکے کمرے میں آیا، تو وہاں کوئی موجود نہ تھا، پھر کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ وہ لان میں ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پاس ہی بہت سارے رنگوں کے مار کر تھے۔ وہ یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی ڈائری کھولے اس میں کچھ لکھ رہی ہے۔ وہ پیچھے ہٹتے کمرے سے باہر نکلا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو امّاں اور ابّا اپنے کمرے میں کسی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ گفتگو کا موضوع جانتا تھا، لہذا مسکراتا ہوا لان کی طرف بڑھا۔ لیکن اُسی لمحے لینڈ لائن کی گھنٹی بج اٹھی، وہ رکا، پھر ٹیلیفون کے پاس چلا آیا۔ سی ایل آئی پر عمر کا نمبر تھا، وہ مسکرایا۔

''ہاں جی! فرمایئے؟'' اس نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''اور لیلیٰ کے مجنوں؟ کیا حال ہیں آپکے؟'' عمر کی مسکراتی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی تو اُسکی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''بہت اچھے! آپ سنایئے ماسٹرز کیسا جا رہا ہے؟'' اتنی عزت پر عمر ہنس دیا۔

''بہت اچھا، کافی دنوں سے تم سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ یونیورسٹی میں بھی نہیں مل پاتے تم۔ یہ بتاؤ تم ملنے کیلئے گھر کب آ رہے ہو؟'' عمر نے شکوہ کن انداز میں کہا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ الگ الگ ہونے کے باعث اب ملاقات کم کم ہی ہو پاتی تھی، اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ماسٹرز میں داخلہ ہونے کے ساتھ، تقریباً اُن سب نے ہی شام کے اوقات میں نوکری کرنا شروع کر دی تھی۔ رضا کوچنگ سینٹر میں پڑھا

رہا تھا، نوید ایک سوپر سٹور کا فلور منیجر تھا، علی میڈیکل سٹور میں اسسٹنٹ سیلز منیجر تھا، عمر شام کے اوقات میں آرٹس کلاسز لیتا تھا، خود مقدم ایک بیکرز برانڈ میں ایم ٹی او تھا، جبکہ حسین فلحال اپنے باپ کے ساتھ انکے آفس جارہا تھا۔ اتنی مصروفیات کے دوران، انکے لیے ایک دوسرے سے ملنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مہینوں گزر جاتے تھے، ساتھ مل کر کہیں بیٹھے ہوئے لیکن دوستی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

''اب تو ڈائریکٹ شادی کا کارڈ لے کر آؤنگا''اس نے شرارت سے کہا تو عمر اُچھل پڑا۔

''کیا کیا کیا؟''وہ تقریباً چیخا تھا۔''کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی جو سن رہے ہو''اُسکے سکون میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔

''تمہارا مسئلہ حل ہو گیا؟''اُس نے پوچھا۔

''تقریباً آدھے سے زیادہ''

''صبح صبح کیا زبردست خبر سنائی ہے۔''وہ حقیقتاً خوش تھا۔

''تمہاری صبح اب ہوئی ہے؟''مقدم نے مشکوک نظروں سے گھڑی کو دیکھا، جو دوپہر کے دو بجا رہی تھی۔

''بس یار! رات بھر پروجیکٹ پر کام کرتا رہا تھا۔ اسی لیے صبح دیر سے اٹھا ہوں''اُسکے بعد وہ دونوں کافی دیر بات کرتے رہے اور اگلے ہفتے ملاقات پر اتفاق کر کے ہی فون بند کیا۔ عمر سے بات کرنے کے بعد وہ سیدھا لان چلا آیا، جہاں لیلیٰ اب بھی بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر اُسکے برابر میں درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

''بس؟ اتنا چھوٹا سا دل ہے تمہارا؟ ذرا سی مشکل میں رونے لگ گئی''اُس نے پوچھا، تو لیلیٰ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ آنکھیں اب بھی سرخ تھیں۔

''اب یہ آنسو بچا کر رکھو اپنی رخصتی پر بہانہ''اس نے شرارت سے کہا تو لیلیٰ نے خفگی سے اُسے دیکھا۔

''مجھے تنگ مت کرو''وہ رخ پھیر کر ڈائری کے صفحات الٹنے لگی۔ مقدم دیکھ سکتا تھا کہ ڈائری ختم ہونے کے قریب تھی۔

''اچھا بات تو سنو! اب گھر تو جانا ہی پڑے گا۔ لڑکے والے یہاں دیکھنے تھوڑی آئیں گے تمہیں''

''بھاڑ میں جاؤ'' وہ غصّے سے کہتی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''رکو!'' وہ جلدی سے اُسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کیوں تنگ کر رہے ہو مجھے؟ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں'' وہ رو دینے کو تھی، مقدم مزید اُسے چھیڑنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے سنجیدہ ہوا۔

''امّاں مان گئی ہیں''

''تم جھوٹ بول رہے ہو'' اُسے یقین نہ آیا تو مقدم نے تھوڑی دیر پہلے ہوئی اپنی اور امّاں کی ساری گفتگو اُسکے گوش گزار کر دی۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟'' مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح اس نے اپنا سوال دہرایا، تو مقدم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''یا اللہ!۔۔ لڑکی! کیسے یقین دلاؤں تمہیں؟''

''تھینک یو مقدم! تھینک یو سو مچ'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا، تو وہ بس اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''اب اپنی امی کو راضی کر لینا''

''ضرور کر لونگی'' وہ کہتے ہوئے اندر بھاگی تو وہ خوشی سے ہنس پڑا۔

----------+----------+----------

اور پورے چھ ہفتے بعد جب مقدم اپنی اور لیلیٰ کی بات پکی ہونے کی خوشی میں مٹھائی لے کر آیا، تو حسین نے اُسے گود میں ہی اٹھا لیا تھا۔

''کیا کر رہا ہے بھائی؟ میں صحیح سلامت اپنے نکاح میں شامل ہونا چاہتا ہوں'' وہ چیخ پڑا لیکن حسین صاحب کو کہاں فرق پڑنا تھا؟ باقی سب ہنس رہے تھے۔

''یہ پہلا مجنوں ہے، جسکو اپنی لیلیٰ مل رہی ہے'' حسین کی بات پر سب متفق ہوئے۔

"تجھے قسم ہے، کہ مجھے نیچے اتار دے"اس نے منّت کی تو بلآخر حسین نے اُسے اتار ہی دیا۔اب باقی سارے ڈیپارٹمنٹ کے باغیچے میں بنی گھاس پر بیٹھے مٹھائی سے انصاف کر رہے تھی۔

"ویسے مقّی! خالی نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ شادی ہی رکھ لیتے"نوید نے پوچھا۔

"نہیں بھائی! ابّا نے کہا ہے کہ رخصتی لیلیٰ کی پڑھائی کے بعد"

"تو نکاح رخصتی کے ساتھ ہی رکھ لیتے۔ابھی صرف منگنی کر لیتے؟"علی نے پوچھا۔نکاح چار ماہ بعد، یعنی اُسکے ایم بی اے کے آخری سمسٹر کے بعد تھا۔

"مجھے اپنی امّاں اور پھوپھو کا قطعاً کوئی بھروسہ نہیں ہے۔اِدھر منگنی ہوئی اور دو سالوں کے درمیان اُن میں کوئی جنگ چھڑ گئی تو پھر واقعی مجنوں والا حال ہو گا میرا۔اس لیے نکاح رکھوا دیا ہے ابّا نے"اس نے بتایا۔

"بات سنو، پاگل آدمی!"اس سے پہلے کہ کوئی مزید کچھ کہتا، ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز پر سب کی گردنیں پیچھے مڑیں تھیں، سوائے حسین کے، کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ مخاطب وہی ہے۔سب نے ایک نظر پکارنے والی کو دیکھا اور شناسا چہرہ نظر آنے پر اطمینان سے دوبارہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

"تم سے بات کر رہی ہوں۔بہرے ہو گئے ہو کیا؟"وہ تن فن کرتی حسین کے سر پر تھپڑ لگاتی وہیں بیٹھ گئی۔

"کیا ہے؟"اس نے بیزاری سے اسکو دیکھا۔

"مجھے بتایا کیوں نہیں آج سمسٹر فیس بھروانے کی آخری تاریخ ہے؟"گھاس پر اپنا بیگ رکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے خود صبح پتہ چلا ہے"

"اب پتہ چل گیا نا؟ جا کے اپنے ساتھ میری بھی بھروا دو۔شاباش"یہ درخواست نہیں حکم تھا۔

"میں نے خود اپنی ایمان سے بھروائی ہے"اس نے مزے سے کہا تو حور عین سمیت باقی سب کا بھی منہ کھل گیا۔

''تمہیں شرم نہیں آئی اس سے اپنا کام کرواتے ہوئے؟''اس نے کھینچ کر اُسکے بازو پر مکا مارا تھا، باقی سب اُنہیں نظر انداز کیے دوبارہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

''تمہیں آتی ہے مجھ سے کام کرواتے ہوئے؟''حساب کہاں اُدھار رکھتا تھا۔پلٹ کر اُسکے سر پر بھی تھپڑ لگا دیا۔

''تمہیں تو میں۔۔۔''اس نے اپنی فائل اُسکے سر پر دے ماری۔

''بس کر دو، جہاں بیٹھتے ہو لڑنا شروع کر دیتے ہو''علی نے دونوں کو ڈپٹا تھا۔ پچھلے دو تین سالوں میں، وہ اُنہیں جنگلیوں کی طرح لڑتا دیکھ چکے تھے۔

''میں کیا کروں اب؟میری فیس کون بھرے گا؟''اس نے روہانسی لہجے میں پوچھا۔

''تم خود بھرو گی۔ بینک دو قدم پر ہی تو ہے''شہر کہ ہر بینک کی شاخ جامعہ میں ہی موجود تھی۔ لیکن آج آخری تاریخ ہونے کی وجہ سے تمام بینکوں میں رش کی انتہا تھی۔

''ہاں! لیکن وہاں اتنی لمبی لائن ہے''اس نے معصومیت سے کہا، جس کا حسین پر رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔

''مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا، میں نے پہلے ہی ایمان سے اپنا کام کروایا ہے''اس نے صاف ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

''لاؤ مجھے دو، میں جمع کر دونگا۔ مجھے اپنی بھی کروانی ہے''رضا نے کہا۔اِس لایعنی بحث کو ختم کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اپنی خدمات پیش کر دے۔

''اوہ! تھنک یو رضا بھائی!''اُس نے خوشی سے فی واؤچر اور پیسے اُسکے حوالے کیے۔

''کوئی بات نہیں''وہ مسکرایا۔

''یہ مٹھائی کس خوشی میں ہے؟''اب جا کر اُسکی نظر مٹھائی پر پڑی تھی۔

''مقدم کے نکاح کی خوشی میں''عمر نے کہا۔

''واقعی میں؟'' وہ خوش ہوئی۔

''پہلے آتی تو مل جاتی، اب ختم ہو گئی ہے اس لیے بھاگ جاؤ یہاں سے'' حسین نے کہتے ہوئی مٹھائی کا پورا ڈبہ قبضے میں کر لیا۔

''اِدھر دو یہ، جب دیکھو سوکنوں کی طرح لڑتے رہتے ہو'' مقدم نے اس سے ڈبہ واپس لیا، کہ آیا دوبارہ جنگ نہ چھڑ جائے۔

''یہ لو، تمہارے لیے بھی رکھی تھی'' اس نے مٹھائی کا ڈبہ حور عین کے حوالے کیا، جو اس نے حسین کو منہ چڑاتے لے لیا۔

----------+----------+----------

''آج کل تو لوگوں کو میں نظر ہی نہیں آتا'' وہ چابی اٹھاتا ہوا، گھر سے نکل رہا تھا۔ جب لان میں اپنے ایک پیٹھی کے بھائی سے ٹاکرا ہو گیا۔ شام کے سات بج رہے تھے اور وہ بھائی صاحب اس وقت بھی ڈمبل لیے مشقیں کرنے میں مصروف تھے۔

''میں تو آتا ہوں تمہارے ساتھ بیٹھنے، تم سے بات کرنے، لیکن تم ہی لگے رہتے ہو ایکسر سائز میں'' عمر جواب دیتا اسکے پاس ہی چلا آیا۔

''سفید جھوٹ، تمہیں عمارہ کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''غلط، تمہیں اپنے ڈمبلز کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا'' اس نے دوبدو جواب دیا۔

''صحیح ہے بھئی، صحیح ہے۔ اب تو میں ہی غلط لگوں گا''

''بس کر دو، اس وقت واقعی تم مجھے اپنی پہلی بیوی اور عمارہ کی سوکن لگ رہے ہو'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کہاں ہوتے ہو یار؟ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں ساتھ بیٹھ کر چائے کا ایک کپ پیئے'' اس نے شکوہ کیا۔

''سوری یار! بس پڑھائی ہی اتنی مشکل ہو گئی ہے۔ ابھی بھی علی کی طرف جا رہا ہوں، ہمیں ملٹی فنکشن فرنیچر پر پروجیکٹ کرنا ہے ساتھ'' اُس نے تفصیلاً بتایا۔

''ہاں! ایک تمہاری پڑھائی ہی مشکل ہے، ہم تو جیسے پڑھتے نہیں ہیں'' وہ زیادہ ہی تپا ہوا تھا۔

''کیاہو گیاہے تمہیں آج؟''عمر نے حیرت سے اُسے دیکھا۔جواباًوہ خاموش ہی رہا،اور اپنی مشقیں جاری رکھی۔عمر نے غور سے اُسے دیکھا وہ ناراض ناراض سا نظر آتا تھا۔اچانک ہی اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''اوہ سوری!۔۔۔تمہاری کانووکیشن تھی نا آج؟''اُس نے پوچھا۔

''آگیا یاد تمہیں؟''اس نے پر شکوہ انداز میں اُسے دیکھا تھا۔

''رئیلی سوری!میں پتہ نہیں کیسے بھول گیا؟''عمر نے جلدی سے اُسکا بازو تھاما۔آج اُسکا بھائی آفیشلی گریجویٹ ہوا تھا۔وہ کیسے یہ بات بھول گیا؟جب عمر نے بی بی اے کی ڈگری لی تھی،اس دن خضر نے کتنے بھرپور طریقے سے جشن منایا تھا۔اور ایک وہ تھا،اتنی بڑی بات بھول گیا۔

''سوری یار!''اس نے آگے بڑھ کر اپنے ناراض ناراض سے بھائی کو گلے لگایا۔

''یاد نہیں تھا نہ تمہیں؟''اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

''یاد تھا،بس۔۔۔۔پتہ نہیں کیسے ذہن سے نکل گیا؟معاف کردے یار آج۔''عمر نے پیار سے اُسکا چہرہ تھاما تو وہ کچھ لمحے اسے گھورتا رہا،پھر ہنستے ہوئے اُسکے گلے لگ گیا۔

''مبارک ہو بہت''عمر نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ اور اپنا کام ختم کر کے واپس آؤ،کل دونوں بھائی مل کر سلبریٹ کرینگے''

''کل کیوں؟آج ہی کرینگے،میں کام ختم کر کے واپس آؤنگا تم سونا نہیں،دونوں مل کر مووی دیکھیں گے،پزا آرڈر کرینگے۔پارٹی ہو گی آج''عمر نے کہا۔

''یہ کی نہ تم نے بات،جلدی سے جاؤ اور واپس آؤ''وہ خوش ہوا۔

''کونسی پارٹی ہو رہی ہے میرے بغیر؟''دیوار کے اس پار سے عمارہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

''بس اسی کی کمی تھی،کبھی ہمیں اکیلے بھی چھوڑ دیا کرو''خضر نے کہا۔

''کیوں چھوڑوں؟ تم نے کبھی چھوڑا ہے ہمیں اکیلے؟''اس نے دوبدو جواب دیا۔

''بھابھی جی، وہ میرا بھائی پہلے ہے، آپکا منگیتر بعد میں''خضر نے یاد دلایا،اِس ساری گفتگو میں، عمر بس ہنس رہا تھا۔

''اچھا بس کرو اب، ہم دونوں آج خضر کے آفیشلی گریجویٹ ہونے پر پارٹی کرینگے۔اور رات کو کرینگے تو تم تو بلکل بھی نہیں آسکتی''عمر نے پہلے ہی ہری جھنڈی دکھادی۔

''ہاہاہا۔۔۔''عمر کے اس جواب پر خضر دل کھول کر ہنسا تھااور عمارہ "ہونہہ "کرتے ہوئے دیوار کے پیچھے گم ہو گئی۔

''محبوبہ کو ناراض کر دیا۔۔ چچ چچ۔۔۔''

''کوئی بات نہیں ایک دن بھائی کے لیے محبوبہ کو ناراض کیا جاسکتا ہے''اس نے ہنستے ہوئے کہااور چلا گیا۔

----------+----------+----------

علی کے گھر سے واپسی پر اُسکی گاڑی چلنے سے انکاری ہو گئی، تو اس نے میکینک کو بلایا، میکینک فالٹ ڈھونڈ رہا تھااور اُسے شدید کوفت ہو رہی تھی۔اُس نے خضر سے وعدہ کیا تھا جلدی آنے کا، مزید اُسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

''بس بھائی! دو منٹ اور دیں مجھے، میں فالٹ ڈھونڈ لوں ایک بار، تو کام آسان ہو جائے گا''میکینک نے کہا۔

''بس جو بھی کرو جلدی کرو''التجائیہ انداز میں کہتے اُسکی نظریں ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔تب ہی اس نے دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی شخص فوٹ پاتھ پر تیز تیز چلتا ہوا جا رہا تھا۔وہ اندھیرے میں بھی اُسے پہچان گیا تھا۔اس نے عمر کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسی طرح آگے بڑھ گیا۔عمر کو کسی کی ٹوہ لینے کی عادت نہ تھی، لیکن اُسکے انداز میں جو پریشانی تھی۔اُس نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔

''کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو؟ مجھے جا کر دیکھنا چاہیے''اس نے سوچا، پھر میکینک کو پانچ منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر اُسکے پیچھے چل پڑا۔وہ خاموشی سے سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔اور عمر اُسکے پیچھے پیچھے،ایک بار دل میں خیال آیا کہ اُسے روک کر پوچھے، کہ اُسے ہوا کیا ہے؟ مگر خاموش رہا۔وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، سٹریٹ لائٹس کی روشنیاں کم ہوتی جا رہی تھیں۔عمر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا

تھا کہ وہ اتنی سنسان اور اندھیری جگہ پر کرنے کیا آیا ہے؟ پھر اچانک ہی وہ رکا، وہ بھی اس سے کچھ دور رک گیا تھا۔ پھر وہ جا کر ایک بینچ پر بیٹھا اور اگلے ہی لمحے فضاء میں اُسکی سسکیوں کی آواز گونجی تھی، وہ رو رہا تھا۔ عمر ششدہ رہ گیا۔

''رضا!'' عمر نے اُسکا نام لینا چاہا پر آواز نے ساتھ نہ دیا۔ وہ درخت کے پاس ہی کھڑا اُسے دیکھے گیا۔ وہ رو رہا تھا، بچوں کی طرح، اس طرح ٹوٹتے ہوئے تو اُسے کبھی نہ دیکھا تھا عمر نے، کس نے رُلایا تھا اُسے؟ کس نے یوں توڑا تھا اُسے؟ وہ ہاتھوں کی مٹھی بنائے بینچ پر مارتا، ضبط کی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ اُسکی سسکیوں کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔ عمر کے لیے وہاں کھڑے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ کتنا اکیلا تھا رضا؟ اس نے رونے کے لیے بھی تنہائی تلاش کی تھی۔ جب اُسکے رونے میں کمی نہ آئی تو عمر آگے بڑھا اور اُسکے قریب جا کر رکا۔ رضا نے نظریں اٹھا کر بھی اُسے نہ دیکھا، بلکہ ایسے ہی سسکتا رہا۔ عمر نے اُسکے گرد بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بس رضا! بس'' اس نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی، پر وہ روتا رہا۔ اُسکی ہچکیاں بندھ گئی تھی۔

''ٹھیک ہو جائے گا سب'' اس نے اُسکے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ وہ اسے خضر جتنا ہی پیارا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اب وہ اور عمر اُسی بینچ پر تھوڑا فاصلہ قائم کیے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ عمر نے اُسکی جانب ٹشو پیپر بڑھایا، جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا۔ کچھ دیر مزید خاموشی سے سرکے۔

''گھر جاؤ گے رضا؟'' عمر نے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''تو اٹھو پھر، چلتے ہیں ہم'' عمر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھا، پھر دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پورے راستے دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ پھر وہ اُس کی گاڑی کے قریب پہنچے۔

''اچھے وقت پر آئے ہیں آپ، گاڑی ابھی ابھی ہی ٹھیک ہوئی ہے'' میکینک نے اُسے دیکھ کر کہا۔

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں رضا''

''میں چلا جاؤنگا'' اتنی دیر میں اس نے یہ پہلی بات کی تھی۔ عمر نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور رضا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''بیٹھو'' پر وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔

''بیٹھ جاؤ رضا! یہاں سے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی'' حسین ہوتا تو زبردستی بٹھالیتا، عمر تھا، قائل کرتا تھا زبردستی نہیں۔اس بات پر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ عمر نے میکینک کو فارغ کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا، پھر ڈیش بورڈ پر رکھی پانی کی بوتل اٹھا کر اُسکی جانب بڑھائی، اُس نے خاموشی سے تھام لی۔ رضا سے گھر کا پتہ پوچھنے کے بعد اس نے گاڑی سٹارٹ کر دی تھی۔ دو نفوس کے موجود ہونے کے باوجود بھی گاڑی میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رضا شیشے پر سر ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔ عمر ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا پر کہتا کچھ نہیں۔اُسکا گھر آ گیا تو وہ عمر کو آہستہ سے شکریہ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا۔ وہ واپس اپنے خول میں بند ہو چکا تھا۔ جب تک وہ گھر کے اندر نہیں چلا گیا، عمر وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔اس نے وقت دیکھا، رات کے بارہ بج چکے تھے۔اس نے خضر سے وعدہ کیا تھا کہ آج رات وہ جشن منائیں گے۔اُسے اپنا وعدہ ہر صورت پورا کرنا تھا، لیکن رضا کو اس طرح روتا دیکھ کر اُسکا دل عجیب سی اُداسی سے بھر گیا تھا۔ وہ اتنا پراسرار کیوں تھا؟ پچھلے چھے سالوں سے اُسکے ساتھ ہونے کے باوجود بھی، وہ اُسکے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ وجہ اُسکی ناراضگی نہ تھی، بس وہ اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ عمر کچھ دیر وہیں کھڑا اُسکے بارے میں سوچتا رہا پھر گہری سانس بھر کر گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

----------+----------+----------

''اچھی بھلی عقل مند اور باشعور لڑکی تھی۔ مجھے اس سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔'' علی نے افسوس سے کہا تھا۔

''میں بھی یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ ایسی کیا مجبوری تھی اُسکی، جو اس نے یہ فیصلہ لے لیا؟'' مقدم کے لہجے میں بھی افسوس تھا۔

''کس کی بات کر رہے ہو تم لوگ؟'' عمر ابھی ابھی وہاں آیا تھا، وہ سارے کینٹین میں بیٹھے تھے سوائے رضا کے۔

''ایمان کی'' نوید نے کہا۔

''کیا ہوا ہے اسکو؟'' اس نے ایک کرسی پر بستہ رکھا اور خود دوسری پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''یہ پوچھو کیا کیا ہے اس نے؟'' مقدم نے کہا۔

''بتا بھی چکو'' وہ اس ڈرامے بازی سے بیزار ہوا۔

''منگنی کرلی ہے اُس نے،اپنے حسین سے''نوید نے بم پھوڑا۔

''واقعی؟''عمر نے حیرت سے پاس بیٹھے حسین کو دیکھا۔اُس نے اثبات میں سر ہلایا،اُسکا اطمینان قابل دید تھا۔

''پر کیوں؟''اُس نے جس صدمے کی کیفیت میں پوچھا تھا،وہاں زور کا قہقہہ پڑا تھا۔

''کیا مطلب کیوں؟''حسین نے گھورا۔

''ہاہاہا۔۔۔اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی،گھر والوں نے زبردستی کی ہوگی''

''ہوگیا تم لوگوں کا؟''حسین نے اُن سب پر ایک نظر ڈالی،جو اپنی اپنی ہنسی روکنے کی رتی بھر کوشش بھی نہ کر رہے تھے۔

"زبردستی تو میرے ساتھ ہوئی ہے۔وہ تو خوش ہے کہ اتنا ہینڈسم اور خوبرو لڑکا ملا ہے اُسے''اُس نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُسکے ساتھ کتنی ناانصافی ہوئی ہے۔

''کیا کہا؟ ہینڈسم اور خوبرو۔۔۔ہاہاہا۔۔۔اچھا مذاق تھا''مقدم نے کہا۔

''ہاں ہاں!اڑالو میرا مذاق،اب میں بھی کسی کو مٹھائی نہیں کھلا رہا''

''مٹھائی کس بات کی بھائی؟اس بات پر تو تعزیت بنتی ہے۔وہ بھی ایمان سے''علی نے کہا۔

''رضا کدھر ہے؟''نوید کو یکدم ہی رضا کی کمی محسوس ہوئی تھی۔آج کافی دنوں کے بعد سب ساتھ بیٹھے تھے۔ورنہ علی اور عمر آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں،نوید انگلش میں،جبکہ رضا،مقدم اور حسین بزنس ایڈمنسٹریشن میں ہوتے تھے۔جسکے باعث سب کی ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی۔کبھی کوئی موجود نہیں ہوتا تو کبھی کوئی۔۔۔

''پتہ نہیں،کلاس ختم ہونے کے بعد غائب ہوگیا تھا''مقدم نے بتایا۔

''تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ آج ہم ساتھ بیٹھ رہے ہیں''نوید نے پوچھا۔

''وہ ملتا تو بتاتا ناں، آج کل وہ کلاس میں دیر سے پہنچتا ہے اور کلاس ختم ہونے کے بعد رکتا نہیں ہے، فوراً بھاگ جاتا ہے۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہوئے بھی ہماری اس سے کم کم ہی بات ہو پاتی ہے'' مقدم نے بتایا تو وہ حیران ہوا۔

''میں نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔ خاموش تو پہلے ہی رہتا تھا، لیکن اب ذرا بجھا بجھا سا رہنے لگا ہے۔'' نوید نے کہا۔

''فون کر لو اسے'' علی نے مشورہ دیا۔

''نہیں رہنے دو، گھر جا چکا ہو گا وہ، اب واپس تھوڑی آئیگا اتنی دور سے'' حسین نے کہا۔ اس ساری گفتگو کے دوران عمر خاموش ہی رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ اُس رات والے واقعے کے بعد سے، رضا اُسکے سامنے آنے سے کترا رہا ہے۔ وہ اپنے خول سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ تو اس رات عمر نے اُسے دیکھ لیا تھا، وہ بھی اُس روپ میں، جس میں رضا کو دیکھنے کا، اُس نے تصوّر بھی نہ کیا تھا۔ اب رضا اُسکا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عمر بھی اُسے تنگ نہیں کر رہا تھا، وہ اسے اسپیس دے رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کچھ دنوں میں وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی ایسا ہی، کچھ ہی دنوں میں وہ خود ہی سب کے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ سب ہی نے اُس سے غائب رہنے کی وجہ پوچھی تھی۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ اُسکی آنکھوں کے نیچے چھائے گہرے حلقوں اور بجھی بجھی سی طبیعت نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ وہ عمر سے بھی عام سے انداز میں ملا تھا۔

اپنے اور رضا کے درمیان ہونے والے واقعے کا حسین نے بھی، کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔

رضا کے اس طرح غائب رہنے پر سب ہی حیران تھے سوائے عمر اور حسین کے۔ حسین تو جانتا تھا کہ اُسکی زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔ البتہ عمر کیوں پر سکون تھا؟ اس بارے میں وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ کچھ عرصے منظر سے غائب رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ سب کے ساتھ بیٹھنے لگا، تب اُنہیں شدت سے احساس ہوا کہ، کچھ تھا اس میں جو تبدیل ہو گیا تھا۔ کچھ تو ہوا تھا اُسکے ساتھ۔۔۔ صرف اُسکا چہرہ ہی نہیں۔۔ اُسکی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ کچھ ایسا تو تھا جو وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ بہت کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ اُن میں سے کسی نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ حسین نے سوچا تھا کہ ذرا پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو آرام سے اس سے بات کریگا لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اب ایسا وقت کبھی نہیں آنے والا تھا۔

----------+----------+----------

ہر شے مقدّم کی خواہش کے مطابق ہی تو ہوئی تھی۔اُسکے ماسٹرز کے فائنل پیپرز ہو جانے کے بعد اُسکا اور لیلیٰ کا نکاح ہو گیا۔ سفید رنگ کے کرتا شلوار پر گرے واسکوٹ پہنے مقدم بہت خوش لگتا تھا۔

''دیکھو ایسا ہے کہ تمہیں قبول ہے، قبول ہے بولتا دیکھ مجھے بہت ہنسی آئیگی''حسین نے اُسکے کان میں کہا تھا۔

''عمر! اگر اس آدمی نے میرا فنکشن برباد کرنے کی کوشش کی، تو تم ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی، اسے کمرے میں بند کر دینا''اُس نے فوراً اپنے جگری یار سے مدد طلب کی۔

''جیسا آپکا حکم''اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور حکم کی تعمیل کے سلسلے میں حسین کی جانب بڑھا۔

''خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ میں کہیں نہیں جا رہا یہاں سے''وہ جا کر رضا کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

نکاح کے بعد سفید گھیر دار فراک میں ملبوس لیلیٰ کو وہاں لا کر بیٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں اتنے پیارے لگ رہے تھے ساتھ کہ نگاہیں ہٹتی نہ تھیں۔

عمر اپنے ہینڈی کیمرے سے دھڑا دھڑ تصویریں بنا رہا تھا، جبکہ حسین نے سب سے پہلے اپنا تعارف کروایا تھا لیلی کو، اور اس سے پہلے کہ وہ مقدم کے تمام کردہ اور ناکردہ کارنامے اُسکے گوش گزار کرتا، نوید اُسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، ہر شے پلان کے مطابق چل رہی تھی۔ لیکن زندگی ہمیشہ ہمارے منصوبوں کے مطابق نہیں چلتی۔

نکاح کے بعد علی صاحب نے اپنی شادی کا بم پھوڑ دیا تھا۔ لیلیٰ تو چھٹیاں گزارنے سوات چلی گئی تھی، اب وہ سب علی کی شادی میں مصروف تھے، جو کہ اُسکے ابّا کے دوست کی بیٹی سے تھی۔ علی اکلوتا تھا، لہٰذا اُسکے بھائی، دوست، کزن سب کا فریضہ وہی پانچوں انجام دے رہے تھے۔اُنہوں نے ہر کام اتنی ذمے داری سے اپنے سر لیا تھا کہ علی کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا۔

لیکن۔۔۔۔

پھر ایک دن مقدم غائب ہو گیا۔

وہ علی کے ولیمے کا دن تھا۔ صبح سے ہی وہ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے۔ شام ہوتے ہوتے باقی چاروں تو پہنچ گئے، پر مقدم نہ آیا۔ عمر نے اُسے بہت فون کیے لیکن جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔

''یار! ایک کام کرو، تم میں سے کوئی جا کر اُسکے گھر دیکھ آؤ۔ کل رات تک تو ہمارے ساتھ ہی تھا ایسے اچانک کیسے غائب ہو گیا؟'' علی کو بھی پریشانی ہوئی تھی۔ اب بس وہ لوگ ہال کے لیے نکلنے ہی والے تھے لیکن وہ نہیں پہنچا تھا۔

نوید اور رضا گئے تھے اُسکے گھر مگر وہاں تالا لگا تھا، مجبوراً وہ لوگ اُسکے بغیر ہی ولیمے میں شریک ہوئے تھے۔ اُسکے بعد اگلے پانچ ماہ، اُن سب نے مقدم کو ہر اس جگہ ڈھونڈا تھا، جہاں اُسکے ملنے کے ذرا بھی امکانات موجود تھے۔ لیکن وہ کہیں نہ ملا تھا۔ اُسکا نمبر بند تھا، گھر پر تالا تھا، جس بینک میں وہ ملازمت کر رہا تھا، وہاں بھی آخری دن وہ تب ہی آیا تھا، جس روز علی کا ولیمہ تھا۔ بینک سے بھی وہ بنا بتائے غائب ہوا تھا۔ یونیورسٹی سے بھی اُسکا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ محلے والے بتاتے تھے کہ ایک رات وہ سب لوگ بہت جلد بازی میں گھر سے نکلے اور پھر کچھ معلوم نہیں کہ کہاں گئے؟ تھک کر انہوں نے بھی اُسے تلاش کرنا چھوڑ دیا، اس امید پر کہ شاید ایک دن وہ خود ہی واپس آ جائے، لیکن اُسے آنا تھا نہ وہ آیا۔ حتٰی کہ باقی سب نے اُسے مردہ خیال کر لیا تھا۔

باقی دن ایسے ہی گزر گئے۔ وہ سب ہی اب پروفیشنل زندگی کی طرف قدم بڑھا چکے تھے۔ کوئی نئی جاب تلاش رہا تھا، کوئی اپنے بزنس پلان پر کام کر رہا تھا، کسی کا نکاح ہو رہا تھا، تو کوئی اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف، عرض زندگی بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ پھر ایک دن اچانک عمر نے اپنے امریکہ جانے کا اعلان کر دیا۔ اس بات کی کسی کو امید نہ تھی۔ نہ اُس کا ایسا کوئی منصوبہ تھا۔ لیکن وہ کہتا تھا کہ یہاں کیریئر بنانے کے مواقع بہت کم ہیں۔ وہ شاید چار پانچ سالوں تک واپس نہ آنے کا کہہ رہا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمر ایسی باتیں کر رہا ہے؟ اور کیوں کر رہا ہے؟ یہاں بھی تو نوکری کے بہت مواقع ہیں لیکن وہ بھی بضد، کسی طرح بھی رکنے کو تیار نہ تھا۔ اور پھر وہ بھی چلا گیا۔ جانے کے بعد اس نے کسی سے بھی رابطہ نہ رکھا تھا۔ کوئی سمجھ نہ سکا کہ اس نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے لے لیا تھا؟ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ لیکن مقدم کی گمشدگی کی طرح عمر کا ملک چھوڑ جانا بھی ایک معمہ ہی رہ گیا تھا۔

----------+----------+----------

اتوار صبح دس بج کر دس منٹ، مورخہ چھ جنوری:

ٹک۔۔۔۔ٹک۔۔۔۔ٹک

کمرے میں صرف دو آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ایک گھڑی کی سوئیوں کی اور دوسری انکی سانسوں کی آواز، علی نے بہت دیر بعد نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھا تھا۔وہ بھی کسی گہری سوچ میں تھا۔علی کو یاد تھا آج سے چار سال قبل، جب وہ ایک آفس بلڈنگ کی لفٹ میں تھا وہاں اس نے پورے چھ سال بعد اُسے دیکھا تھا۔اُسکے چہرے پر شناسائی کی رمق اُبھری تھی لیکن اس نے فوراً نظریں پھیر لی تھیں۔علی نے بھی اُسے پہچاننے کی رتی بھر کوشش نہ کی تھی۔لیکن وہ کتنے ہی دن اُسکے بارے میں سوچتا رہا تھا۔وہ پاکستان کب آیا تھا؟اور کیوں؟اُسے تو اپنا کیریئر بنانا تھا۔پھر عمر اُسے دو سال تک دوبارہ کہیں دکھائی نہ دیا۔وہ بھی بس ایک اتفاقیہ ملاقات تھی بلکہ ملاقات کیا تھی؟وہ تو دو اجنبیوں کی طرح کچھ دیر اس ایلویٹر میں ساتھ کھڑے رہے تھے۔پھر وہ اُسے بھول گیا۔دو سال قبل اس نے ایک انٹیریئر ڈیزائننگ کے بزنس کے پچاس فیصد شیئرز خریدے تھے۔۔مالک نے بتایا تھا کہ وہ بقایا پچاس فیصد بھی بیچنے کا ارادہ رکھتا ہے۔اور کچھ عرصے بعد اس نے علی کو بتایا کہ وہ شیئرز کے لیے گاہک ڈھونڈ چکا ہے اور خود یہاں سے جا رہا ہے۔اب یہ بزنس علی اور اُسکے نئے شرکت دار کا تھا۔اب اسے قسمت کہیے کہ اُسکا نیا پارٹنر عمر حفیظ تھا۔اس اتفاق پر دونوں ہی سخت حیران تھے۔لیکن جلد ہی اُن دونوں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا اور ایک اچھے بزنس پارٹنر کے طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔وہ بہت زیادہ حقیقت پسند ہو چکے تھے۔انکے درمیان جو بات بھی ہوتی وہ کاروبار کے لیے نئے ٹینڈرز پر، نئی بزنس ڈیل پر یا کاروبار کو مزید بہتر بنانے تک ہی محدود ہوتی۔دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کی پرسنل اسپیس (ذاتیات) میں مخل نہیں ہوتا تھا۔یہ جیسے انکے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا۔ایک بات تو تہہ تھی کہ وہ دونوں دوست نہیں رہے تھے، دونوں ہی نہایت پیشہ وارانہ طریقے سے رہتے تھے۔کسی نے بھی دوسرے سے گئے وقتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔دو سال اسی طریقے سے گزر گئے تھے۔انکے درمیان یہ خاموش معاہدہ تب چٹخا، جب وہ مقدم سے آڈٹ کے سلسلے میں ملنے گئے تھے۔اس سے ملنے کے بعد بے ساختہ ہی عمر نے اُسکے غائب ہونے کا ذکر چھیڑ دیا تھا اور جواب میں علی نے جس صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا اُسکے بعد عمر نے دوبارہ اس بات کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔انکے درمیان موجود لکیر جو کہیں کہیں سے مٹنے لگی تھی اُسے علی نے پھر سے اپنے درمیان کھینچ دیا تھا لیکن آج جن نظروں سے عمر نے اُسے دیکھا تھا وہ اندر تک ہل گیا تھا۔یہ تو واضع نظر آ رہا تھا کہ زیادہ عرصے وہ لوگ ایک دوسرے سے نظریں نہیں چرا سکتے۔کسی نہ کسی دن یہ ذکر نکلے گا، کہیں نہ کہیں تو آ کر وہ لوگ اس موضوع پر سوال جواب کرینگے۔۔۔اور ایسا تب تب ہو گا جب جب مقدم سامنے آئیگا، یا یہ کہنا چاہیے کے اُن میں سے کوئی بھی۔۔۔کیوں کہ پچھلے دس سالوں سے وہ کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا۔

----------+----------+----------

پھر وہ واقعہ ہوا۔۔۔

وہ۔۔۔ جسکا وہ لوگ مر بھی دوبارہ تذکرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

وہ واقعہ جسکے رونما ہونے سے پہلے مقدم پر اسرا طور پر غائب ہو گیا تھا اور جسکے رونما ہونے کے بعد عمر ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور خود رضا؟ اس نے کیا کیا تھا؟ اس نے اُن سب سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے آپ کو اُن سب کیلئے مار دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے، وہ پہلے ہی اُن سب سے قطع تعلق کا ارادہ رکھتا ہو اور بس موقع کی تلاش میں ہو۔ اور وہ موقع اُسے اُس واقعے کی صورت میں مل گیا تھا، اور اُس نے لمحہ بھی نہ لگایا، اُن سب سے دور جانے میں۔ کیوں کیا تھا اس نے ایسا؟ کیوں؟

کیا ہو گیا تھا اُسے اچانک؟

اور آج وہ اُن سب کے سامنے تھا، ایک غیر شناسا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ۔

گئے وقتوں نے اُسکے چہرے پر جتنی سختی چھوڑی تھی، وہ اتنا ہی زیادہ پر کشش ہو گیا تھا۔ آج بھی یقیناً لوگ اُسکی طرف کھنچتے چلے آتے ہونگے۔ اور آج بھی وہ دنیا سے لاتعلق لگتا تھا۔ البتہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں اور بھی زیادہ ماہر ہو گیا تھا۔

ایک ہی کمرے میں بیٹھے چار نفوس۔۔۔

چاروں ایک دوسرے کے لیے بیک وقت شناسا۔۔۔

اور بیک وقت اجنبی بھی۔۔۔

رضا نے نظر اٹھا کر بھی کسی کو نہ دیکھا تھا۔ علی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضع نظر آ رہے تھے۔ عمر خاموش تھا۔ اور مقدم حیران۔۔۔۔

جب وہ یہاں سے گیا تھا تو تب سب دوست تھے۔ اُسے یقین تھا کہ شاید آج بھی سب دوست ہوں۔ غائب تو وہ ہوا تھا، باقی سب تو یہیں تھے۔

لیکن اس وقت حالات کسی اور طرف اشارہ کر رہے تھے۔

ایسا کیا ہوا تھا اُسکے پیچھے ؟ کہ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار نہ تھا؟

کیا وہ لوگ ایک دوسرے کے دوست نہ رہے تھے ؟

ہزاروں سوالات تھے دل میں مگر جواب کہیں بھی نہ تھا۔

مقدم یہاں سے اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔

اِس فضاء میں اُسکا دم گھٹ رہا تھا۔اُسی لمحے ،اُسکی نظریں علی کی کلائی میں بندھی گھڑی پر گئی۔اور اُسکے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

----------+----------+----------

(جاری ہے)

اگلی قسط، ماہِ اگست کی پندرہ تاریخ کو میری ویب سائٹ اور فیس بک پیج پر شائع کی جائیگی۔ان شاءاللہ